ماہیے کے مباحث

حیدر قریشی

ماہیے کے مباحث

حیدر قریشی

Mahiay Kay Mabahis

By

Haider Qureshi

سوال: بعض نقاد تو یہ خدشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ماہیا اگر طوفان کی صورت آیا تو جھاگ کی صورت بیٹھ بھی جائے گا یعنی ماہیا کا کوئی مستقبل نہیں؟

جواب: دنیا جس ڈگر پر جا رہی ہے مجھے تو اس سے ادب کے مستقبل پر بھی تشویش ہونے لگتی ہے۔ جہاں تک ماہیے کا تعلق ہے ہم نے اپنی توفیق کے مطابق کام کیا ہے۔ اور ہمارے کام سے زیادہ خدا نے پھل پھول لگا دیئے ہیں۔ اردو میں کتنی اصناف کبھی بے حد مقبول تھیں اب ان کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔ اس کے باوجود ادب کی ترویج کی تاریخ میں ان اصناف کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سو ماہیے نے تو اتنے مختصر سے عرصہ میں اپنے لئے ایک اہم جگہ بنالی ہے۔ اس لئے مجھے اس کے مستقبل کے حوالے سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ویسے آپ دیکھیں تو اس قسم کا پروپیگنڈہ وہ لوگ کر رہے ہیں جو ماہیے کی بحث میں علمی لحاظ سے ہر سطح پر شکست کھا چکے ہیں اور اپنے دل کے بہلانے کے لئے نجومی بابا بن رہے ہیں۔

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ حیدر نے ماہیے کو سستی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے؟

جواب: اگر میرے مجموعی ادبی کام کے تناظر میں دیکھا جائے تو ماہیے کے چکر میں میرا دوسرا کام کسی حد تک نظر انداز ہوا ہے۔ اپنی غزلوں، اپنے خاکوں اور افسانوں، اپنے سفرنامے اور "کھٹی میٹھی یادوں" کے حوالے سے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں لیکن میں ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ ماہیے کی بحث میں میرا وہ سارا کام پس پشت چلا گیا ہے۔ سو ماہیے کی شہرت مجھے سستی نہیں مہنگی پڑی ہے۔ پھر اوپر سے یار لوگوں کی ملامت۔ جو بھی علمی سطح پر لاجواب ہوا اس نے شخصی دشمنی قائم کر لی۔ جہاں چور اور بے وزن شاعروں اور افسانہ نگاروں کو آسمان پر چڑھا دیا گیا وہاں حیدر قریشی کے لئے زمین پر رہنے کا حق بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ سو ماہیے والی شہرت سے تنویر سپرا مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا ہے

عزت بڑھی تو ساتھ ہی رسوائی بڑھ گئی   تنخواہ کے حساب سے مہنگائی بڑھ گئی

ویسے آپ دیکھیں کہ جن لوگوں کی ادب میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی وہ صرف اس لئے اہم ہو گئے کہ وہ ماہیے کے مخالف ہیں۔ تو ماہیے نے تو اپنے مخالفوں کو بھی شہرت عطا کر دی ہے۔   **حیدر قریشی** (جرمنی)

اختر سلیمی کے لیے گئے انٹرویو سے اقتباس

ماہیے کے مباحث

(مضامین)

حیدر قریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن ۲۰۱۴ء

مضامین کا یہ مجموعہ الگ سے شائع نہیں کیا گیا تھا۔ پانچ کتابوں کے مجموعہ ’’اردو ماہیا تحقیق و تنقید‘‘
میں یہ شامل تھا۔ اب پہلی بار اس کا انٹرنیٹ ایڈیشن الگ سے شائع کیا جا رہا ہے۔

اُلجھے جو فقیروں سے
یوں سمجھو، اُلجھے
اپنی تقدیروں سے

انتساب

احمد حسین مجاہد کے نام

اک اپنا ہزارہ تھا
کتنے نظاروں کا
خوش رنگ نظارہ تھا

نفرت کے اندھیروں کو
توڑ مرے مالک
ظلمات کے گھیروں کو

ترتیب

اردو کے پیاروں کو
اللہ خوش رکھے
سب ماہیا نگاروں کو

(ہمت رائے شرما)

ماہیے کی بحث

(یہ مضمون پرویز بزمی کے نہایت جارحانہ مضمون کے جواب میں لکھا گیا)

''اوراق'' کے شمارہ جنوری فروری ۱۹۹۹ء میں ایک مضمون شائع ہوا ہے ''پنجابی ماہیا کی ہیئت اور وزن''۔اس کے مضمون نگار نے بہت اچھا کیا ہے کہ ''اوراق'' کے اسی شمارہ میں اپنے ماہیے بھی پیش کر دیئے ہیں۔''اوراق'' کے صفحہ نمبر ۳۵۲ پر موصوف کے ۱۸ ماہیے موجود ہیں ان ماہیوں سے ان کے مضمون اور نفس مضمون کو سمجھنے میں خاصی آسانی رہے گی۔

مضمون نگار موصوف کے ایک ماہیے سے بات شروع کرتے ہیں۔

چکوے سے کہوری سکھی

پار کنارے پر تڑپے ہے تری چکوی

موصوف کے اب تک کے شائع شدہ سارے ماہیوں کا وزن مکمل طور پر وہی ہے جس کے لئے ہم لوگ گزشتہ دس سالوں سے اصرار کر رہے ہیں اور مخالفین کا ہدفِ ملامت بھی بنے ہوئے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ موصوف نے اسے ڈیڑھ مصرعی ہیئت میں پیش کیا ہے جبکہ ہم اسے سہ مصرعی ہیئت میں پیش کر رہے ہیں۔اردو میں ماہیے کے بارے موصوف نے عملاً ہمارے موقف کی تصدیق کی ہے بس صرف تین مصرعوں کی ہیئت کی جگہ ڈیڑھ مصرعی ہیئت پر اصرار کیا ہے۔سو اس اختلاف کو پنجابی ماہیے کی روایات کے تناظر میں بہتر طور پر دور کیا جا سکتا ہے۔سہ مصرعی اور ڈیڑھ مصرعی ماہیے کے مسئلہ سے ہٹ کر مضمون نگار نے بہت سے ایسے امور کو بھی چھیڑا ہے جس کے سلسلے میں یا تو ان کی معلومات ناقص ہے یا پھر انہوں نے دیدہ دانستہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔سو اصل اور بنیادی مسئلے پر بات کرنے سے پہلے میں بعض ایسے امور کے

سلسلے میں حقیقت حال واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جن سے غلط فہمیاں پھیلنے کا خدشہ ہے۔

''اوراق'' کے صفحہ نمبر ۳۲۶ پر مضمون نگار نے ماہیے کی بحث کا نچوڑ گیارہ نکات کی صورت میں پیش کیا ہے۔ان میں سے نمبر ۶ کے تحت ریاض احمد کا یہ ادھورا جملہ دیا ہے ''ماہیا کے بول عوامی فنکار ترتیب دیتے ہیں جس سے عروض اور وزن کی پابندی کا تقاضہ بے سود ہے'' حالانکہ اس جملہ سے آگے ریاض احمد کے یہ الفاظ ہیں: ''تاہم ان بولوں کے آہنگ میں عروضی وزن کی تلاش کچھ اتنا بے معنی عمل بھی نظر نہیں آتا''۔شاید یہ جملہ مضمون نگار کو پسند نہیں آیا حالانکہ ریاض احمد کی بات یہیں آ کر پوری ہوتی ہے۔اپنے اس مضمون میں ریاض احمد نے یہ اصولی باتیں بھی لکھی تھیں: ا۔ماہیا صرف ایک شاعری کی صنف ہی نہیں،ایک لَے یا سُر کا نام بھی ہے''۔

۲۔''پنجابی اوزان میں موسیقی کے بنیادی تصورات مثلاً سُر،تال وغیرہ کی مدد سے آہنگ کو اس طرح نمایاں کیا جاتا ہے کہ عروضی وزن اس آہنگ کو مدنظر رکھے بغیر مقرر کرنا مشکل ہو جاتا ہے''۔۔۔۔۔۔

ہم نے اسی آہنگ کی بنیاد پر عروضی اوزان کو دریافت کیا ہے۔

مضمون نگار نے اپنے بیان کردہ نکتہ نمبر ۴ میں میرے اور مناظر عاشق کے حوالے سے ماہیے کے پانچ اوزان کا ذکر کیا ہے اور اگلے صفحہ پر یوں مجھ پر اعتراض کیا ہے۔

''ان کا کہنا ہے کہ اس وقت تک ماہیے کے پانچ وزن دریافت ہو چکے ہیں یعنی ابھی کچھ اور اوزان بھی دریافت ہوں گے۔ایک طرف تو فرماتے ہیں کہ ماہیا سُر،تال کے ساتھ گایا جا سکے اور لے کی روانی میں فرق نہ آئے وہ ماہیا صحیح وزن میں ہے۔دوسری طرف ماہیے کی جو بحریں وجود میں لا رہے ہیں اور جو نئے اوزان سامنے آ رہے ہیں ان کی کچھ صورتیں ملاحظہ فرمائیں''

اس کے بعد مضمون نگار نے یونس احمر اور اشعر اور ینوی کے غلط وزن کے دو دو ''ماہیے؟'' درج کئے ہیں۔یہاں اگر موصوف نے دیدہ دانستہ حقائق کو مسخ کیا ہے تو بھی اور اگر اپنی لاعلمی کے باعث ایسا کیا ہے تو بھی ان کا تجزیہ بے حد افسوسناک ہے۔ڈاکٹر مناظر عاشق کے بیان کردہ عروضی اوزان اور تھے اور میرے بیان کردہ اور ہیں۔ڈاکٹر مناظر نے بھی بعد میں ان اوزان

کوترک کردیا تھا۔ان کے بیان کردہ اوزان ''گلبن'' کے ماہیا نمبر میں چھپے تھےاوران اوزان کے ساتھ ہی یہ بھی درج تھا۔'' ویسے ابھی تک فعلن فعلن فعلن/فعلن فعلن فع/فعلن فعلن فعلن اور مفعول مفاعیلن/فعل مفاعیلن/مفعول مفاعیلن کے اوزان ہی مروج ہیں''۔اس کے باوجود میں نے اپنے مضمون ''اردو ماہیے کی تحریک'' میں (اس مضمون کا آخری حصہ گلبن کے ماہیا نمبر کے تجزیہ کے طور پر الگ سے بھی چھپ چکا ہے) ڈاکٹر مناظر کے ان اوزان کو تسلیم نہیں کیا اور صاف لکھا ہے کہ ''جو اوزان انہوں نے تجویز کئے ہیں وہ ماہیے کی پنجابی لَے سے میل نہیں کھاتے۔اسی لئے انہیں بطور ماہیا قبول نہیں کیا جاسکتا'' -----صرف یہی نہیں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے ادبی رسالہ ''کوہسار جرنل'' کے شمارہ مئی ۱۹۹۸ء میں میرا خط شائع کیا اور میرے موقف سے اتفاق بھی کیا۔گویا جنوری تا اپریل ۱۹۹۸ء کے گلبن میں ان کے متنازعہ اوزان شائع ہوئے اور مئی ۱۹۹۸ء کے ''کوہسار'' میں تنازعہ ختم بھی ہوگیا۔یہاں کوہسار سے میرے خط کا اقتباس پیش کردینا مناسب رہے گا:

''آپ نے ماہیے کی سات نئی بحریں لکھی ہیں (تفصیل کے لئے گلبن کے ماہیا نمبر میں میرا مضمون ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ہرگانوی) ان میں سے صرف ایک بحر فاعلاتن/ فاعلاتن فاعلن/ فاعلاتن فاعلاتن تھوڑی سی ترمیم کے بعد یعنی : فعلاتن فعلاتن/فعلاتن فعلن/فعلاتن فعلاتن میرے لئے محض اس لئے قابل قبول ہے کہ اسے بھی ماہیے کی پنجابی لَے میں گنگنایا جا سکتا ہے۔ باقی کوئی بھی بحر نہ ماہیے کی لَے سے مطابقت رکھتی ہے نہ ہی ماہیا ہے۔ماہیے کے معاملے میں میرا موقف بالکل سیدھا اور سادہ سا ہے کہ جو ماہیا پنجابی ماہیے کی لَے میں گایا جا سکتا ہے وہ ماہیا ہے۔ ہمیں دُھن کی بنیاد پر ہی ماہیے کو قائم رکھنا ہے اور صرف لَے میں آنے والے متبادل اوزان ہی قبول کرنے ہیں۔ (حیدرقریشی صاحب! ہمیں آپ کی رائے سے سو فی صد اتفاق ہے۔نئی بحروں کے تجربے محض تجربے تھے تاکہ مساوی الوزن کہنے والوں کی سوچ بدلے اور انہیں عروضی راستے صاف نظر آئیں۔ ہرگانوی)''۔

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ جو اوزان لَے کے مطابق نہیں تھے میں نے ان

سے اختلاف کیا تھا اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اعلیٰ ظرفی کے ساتھ میرے اختلاف سے اتفاق کرلیا تھا۔لہٰذا یونس احمر اور اشعر اورینوی کی مثالوں سے کسی کو ملزم کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں نے اپنے مضمون ''ماہیا پابندِ لَے ہے'' میں ماہیے کی لَے کی بنیاد پر جو پانچ اوزان پیش کئے تھے وہ بھی یہاں درج کئے دیتا ہوں اور ان کے بعد جو تین نئے اوزان اردو کے عروضی قواعد کی پابندی کے ساتھ سامنے آئے ہیں وہ بھی درج کئے دیتا ہوں۔

۱۔ مفعول مفاعیلن
فعل مفاعیلن
مفعول مفاعیلن

۲۔ فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن

۳۔ فعلات مفاعیلن
فعل مفاعیلن
فعلات مفاعیلن

۳فعلات مفاعیلن
فعل مفاعیلن
فعلات مفاعیلن

۴۔فعلاتن فعلاتن
فعلاتن فعلن
فعلاتن فعلاتن

۵۔ مفعول مفاعیلن
فعل فعولن فع
مفعول مفاعیلن

۶۔مفعول مفاعیلن
فاع مفاعیلن
مفعول مفاعیلن

۷۔ فعلن فعلن فعلن
مفتعلن فعلن
فعلن فعلن فعلن

۸۔مفعولن مفعولن
مفعولن فعلن
مفعولن مفعولن

۸۔ مفعولن مفعولن
مفعولن فعلن
مفعولن مفعولن

اپنے ماہیوں میں میرے موقف کی عملاً تصدیق کرنے لیکن اپنے مضمون میں میرے موقف کو دھندلانے کی کوشش کرنے والے مضمون نگاران اوزان کو ماہیے کی کسی بھی ایسی لے پر گنگنا کر چیک کرلیں جس پر وہ اپنے اردو ماہیے گنگنا سکتے ہیں۔ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔

مضمون نگار کے نکتہ نمبر ۸ اور ۱۰ میں ایک ہی بات ہے۔ پھر ان کے الگ الگ نمبرز لگانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔سمجھ نہیں آئی۔دونوں نکات دیکھ لیں۔دونوں میں ایک ہی بات بتائی گئی ہے۔۸۔'' گاتے وقت اگر لے کی روانی نہ ٹوٹے تو ماہیا صحیح وزن میں ہے''۔۱۰۔''پنجابی میں ماہیا گانے کی ایک خاص دُھن ہے جو ماہیا اس دھن پر پورا اترے گا اس کا وزن درست ہے''۔

نکتہ نمبر ۱۱ میں مضمون نگار نے لکھا ہے ''ماہیے کا وزن مفعو۔۔۔۔۔لفا۔۔۔۔عیلن بھی ہے (حیدر قریشی)'' اور تھوڑا اور آگے چل کر یوں تمسخرانہ انداز اختیار کیا ہے! ''یہ ناقدین اگر پنجاب کے کسی گاؤں میں جائیں اور کسی چرواہے سے ماہیا سُن کر اسے کہیں کہ تمہارا ماہیا ''مفعو۔۔۔۔لفا۔۔۔۔عیلن'' کے مطابق نہیں ہے تو وہ سمجھے گا کہ اسے گالی دی جارہی ہے اور ناقدین کو کسی ناخوشگوار صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا''۔

جواباً میری پہلی گزارش یہ ہے کہ میں نے ماہیے کا وزن مفعولمفاعیلن نہیں قرار دیا تھا بلکہ مفعول مفاعیلن والے وزن کو فعلن فعلن فعلن والے وزن ہی کی تھوڑی سی بدلی ہوئی صورت لکھ کر اسے مفعو لفا عیلن سے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ احمد حسین مجاہد نے اسی حوالے سے اپنا بے حد اہم مضمون ''اردو ماہیا عروضی تناظر میں'' تحریر کیا تھا جس میں عروضی حوالے سے تسکین اوسط کی کرشمہ سازی کو مدلل طریقہ سے واضح اور ثابت کر دیا تھا۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ پنجابی ماہیے گانے والوں کے لئے کسی فعلن فعلن کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ مسئلہ تو ہمیں اردو میں ماہیے کے خدوخال واضح کرنے کے لئے پیش آیا ہے۔ ویسے پنجابی میں بھی ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری، تنویر بخاری، پروفیسر شارب اور متعدد دیگر پنجابی ادیبوں نے بھی ماہیے کی بحث میں بہت سارا فعلن فعلن کیا ہے اور اردو میں یہ مسئلہ سامنے آنے سے بھی پہلے پنجابی میں ایسا ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری اپنے مضمون ''ماہیے دی عروضی بحر'' میں لکھ چکے ہیں۔ ''پنجابی شاعری پر فارسی عروض کو لاگو کرنے کی کاوش ایک نئے سمندر میں ''بیڑا ٹھیلن'' والی بات ہے۔ اس لیے کسی کے رستے کو درست یا غلط کہنے کا ابھی کوئی مطلب نہیں ہے۔ ابھی پتہ نہیں اور کتنے لوگ اس موضوع پر قلم اٹھائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی جس سے بن پڑتا ہے، مبارک ہے'' (پنجابی سے ترجمہ)۔

اس کے باوجود تمسخر کا نشانہ ہم ہی ہیں تو یہ بھی سر آنکھوں پر!

تیسری گزارش یہ ہے کہ پنجاب کے دیہاتی بھی تھوڑا سا عربی قاعدہ ضرور پڑھے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ گالی کے مغالطہ کا شکار نہیں ہوں گے۔ اردو عروض عربی سے آیا ہے اور اس

کے اوزان کو پڑھتے ہوئے صرف وہی شخص گالی کی غلط فہمی میں مبتلا ہوگا جو عربی الفاظ کو اپنی مادری زبان میں لینے کی بے وقوفی کرے گا۔ میری مادری زبان پنجابی ہے اور مجھے مذکورہ اوزان کو پڑھتے ہوئے کبھی کوئی الجھن پیش نہیں آئی۔ شاید یہ اپنے اپنے ذہن کی بات ہے۔

اپنے نکتہ نمبر ۷ میں مضمون نگار نے درج کیا ہے ''ماہیا کا نام بگڑو اور ٹپہ بھی ہے (حیدر قریشی، مناظر عاشق ہرگانوی، افضل پرویز)''۔ اس کے بعد یوں برہمی کا اظہار کرتے ہیں:

''تین مصرعوں کے ماہیا کی وکالت کرنے والے محققین اور شعراء کا کہنا ہے کہ ماہیے کا ایک نام بگڑو ہے اور ایک نام ٹپہ بھی ہے''۔

''بگڑو'' نام کے بارے میں سرائیکی دانشور بشیر ظامی نے کہا تھا کہ بگڑو ہماری زبان کا بہت قدیمی گیت ہے اور افضل پرویز نے ''بگڑو'' نام کی توجیہہ پیش کی تھی لیکن بشیر ظامی اور افضل پرویز دونوں ''تین مصرعوں کے ماہیا'' کے نہیں بلکہ ڈیڑھ، دو مصرعوں کے ماہیا کے وکیل تھے۔ مجھے علم نہیں کہ مضمون نگار موصوف نے جان بوجھ کر انہیں ہمارا وکیل بنایا ہے یا وہ خود بھی اس سے بے خبر تھے۔ ماہیے کا دوسرا نام ٹپہ پنجابی دانشور تنویر بخاری نے بیان کیا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں میری دلی میں امرتا پریتم سے دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان میں ضمناً ماہیے کا بھی تھوڑا سا ذکر رہا تو انہوں نے مجھ سے چند اردو ماہیے سنے اور پھر کہنے لگیں یہ تو ٹپے ہیں۔۔۔ ماہیے کا کوئی نام ٹپہ یا بگڑو تھا، اس پر اتنا بگڑنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ یہ کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ماہیے کا نام اردو میں بھی رائج ہو گیا ہے اور اب یہی زیر بحث ہوتا ہے۔

اب میں مضمون نگار کے اصل اور بنیادی مسئلے کی طرف آتا ہوں ڈیڑھ مصرعی ہیئت کے سلسلے میں ان کا یہ بیان توجہ طلب ہے ''ماہیے کے تین مصرعوں اور وزن کی بحث اتنے زور شور اور تواتر سے چلی ہے کہ اس کے زیر اثر پنجاب کے پیدائشی اور سکونتی شعراء نے بھی ماہیا کو تین مصرعوں کا سمجھ لیا ہے۔ ان کا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ پنجابی میں ماہیا کی ہیئت ڈیڑھ مصرعہ کی ہے''۔

یہاں بھی مضمون نگار غلط بیانی یا لاعلمی کا شکار ہیں۔ خود پنجابی دانشوروں نے پنجابی میں

ہی ماہیے کی ڈیڑھ مصرعی ہیئت کو رد کرتے ہوئے اسے سہ مصرعی ہیئت میں قبول کیا ہے۔ یہ علمی بحث اردو میں ماہیے کی موجودہ تحریک کے آغاز سے بہت پہلے ہو چکی ہے، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ ہماری بحث کے زیر اثر پنجاب کے شعراء نے بھی ماہیے کو تین مصرعوں کا سمجھ لیا۔ ڈاکٹر روشن لال آہوجا اسے تین مصرعوں کا مانتے تھے۔ تنویر بخاری نے پنجابی میں ڈیڑھ مصرعی ماہیے کا ذکر کرنے والے بیشتر دانشوروں کے حوالے درج کرنے کے بعد ان کے موقف کو مسترد کر کے سہ مصرعی ہیئت پر اصرار کیا۔ ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری نے وزن کے سلسلے میں تنویر بخاری سے اختلاف کیا لیکن اپنے اختلافی مضمون میں بھی انہوں نے سہ مصرعی ہیئت پر واضح الفاظ میں صاد کیا۔ یہاں ان کے بیان کا متعلقہ حصہ پیش ہے۔ ''ماہیا ایک چھوٹی نظم ہے۔ اس میں تین مصرعے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اس کے پہلے مصرعہ کو آدھا مصرعہ کہتے ہیں اور اگلے دونوں مصرعوں کو یکجا کر کے، ایک مصرعہ بنا کر پوری چھوٹی نظم کو ڈیڑھ مصرعی کہتے ہیں۔۔۔ تنویر بخاری صاحب نے ڈاکٹر روشن لال آہوجہ کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے اسے ڈیڑھ مصرعی نہیں بلکہ سہ مصرعی تسلیم کیا ہے۔ میں تنویر بخاری صاحب کے موقف کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں'' (ماہیے دی عروضی بحر'' مطبوعہ سہ ماہی ''پنجابی ادب'' لاہور شمارہ اپریل تا جون ۱۹۸۷ء۔۔۔ (پنجابی سے ترجمہ)

ڈیڑھ مصرعی ہیئت کے حامیوں کی ایک لسٹ دینے کے بعد مضمون نگار نے ''اوراق'' کے صفحہ نمبر ۳۲۶ پر ہی یہ درد بھری شکایت کی ہے:

''کئی حضرات نے ماہیا سے کئے جانے والے اس سلوک کے خلاف ضرور صدائے احتجاج بلند کی لیکن ان کی نحیف آواز بہت سے اصحاب تک نہیں پہنچ سکی''۔ اردو ماہیے کی موجودہ تحریک کے آغاز سے پہلے ہی افضل پرویز، عبدالغفور قریشی، مقصود ناصر چوہدری، کرم حیدری، محمد بشیر احمد ظامی وغیرہ نے ڈیڑھ مصرعی ہیئت کا مسئلہ اٹھایا تھا اور اس مسئلے کو علمی و ادبی لحاظ سے ان سے کہیں بڑے پنجابی اسکالرز نے نہ صرف مدلل طریقے سے رد کر دیا تھا بلکہ تین مصرعوں کی ہیئت کو رائج بھی کر دیا تھا۔ یہ جواَب اردو ماہیے کی تحریک کے بعد پنجابی ماہیے کی اصل ہیئت کے علمبردار سامنے آئے ہیں، کیا ان سب نے اس وقت آواز اٹھائی جب ستّر کی دہائی میں لوک ورثہ کے قومی ادارہ نے سہ مصرعی ہیئت میں اسلم جدون کا مرتب کردہ ضخیم انتخاب ''ماہیے'' شائع کیا؟

کیا اس وقت احتجاج کیا جب پنجابی ادبی بورڈ لاہور نے اکادمی ادبیات پاکستان کے تعاون سے تنویر بخاری کی کتاب ''ماہیا فن تے بنتر'' کو شائع کیا؟ ۱۹۸۸ء میں چھپنے والی اس کتاب میں تنویر بخاری نے ڈیڑھ مصرعی ہیئت کو رد کر کے سہ مصرعی ماہیے کا انتخاب پیش کیا تھا۔

کیا اس وقت کسی نے اختلافی مضمون لکھا جب ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری بھی تنویر بخاری کے موقف کو تسلیم کر رہے تھے؟

پھر اردو میں ماہیا کے نام پر ثلاثی قسم کی چیزیں لگ بھگ ۱۹۸۳ء سے چھپ رہی تھیں کیا تب ان پر مضمون نگار موصوف نے صدائے احتجاج بلند کی؟۔ آخر یہ ڈیڑھ مصرعی ہیئت کا شوشہ اتنی دیر کے بعد کیوں چھوڑا گیا؟ اہلِ نظر اس سے بے خبر نہیں ہیں۔

اردو ماہیے کی تحریک کا باقاعدہ آغاز افتخار احمد کے مضمون ''اردو ماہیے'' سے ہوتا ہے۔ یہ مضمون روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی کے ادبی صفحہ پر ۲۴ مئی ۱۹۹۲ء کی اشاعت میں شامل تھا۔ اس میں افتخار احمد نے لکھا تھا ''ماہیا کو ہم دو صورتوں میں لکھ سکتے ہیں'' اور پھر ڈیڑھ مصرعی اور سہ مصرعی دونوں ہیئتوں میں ماہیا پیش کیا ہے۔ میں نے بھی اپنی کتاب ''اردو میں ماہیا نگاری'' کے صفحہ نمبر ۱۳ پر مذکورہ دونوں ہیئتوں کی مثالیں درج کرنے کے بعد لکھا تھا: ''یہ اختلاف رائے صرف ماہیے کو تحریری صورت میں پیش کرنے کا ہے۔ وگرنہ مذکورہ بالا دونوں ہیئتوں میں ماہیے کا اصل وزن محفوظ ہے۔ اگرچہ ماہیا کو تین مصرعوں کی ہیئت میں واضح پذیرائی مل چکی ہے اور یہی صورت ماہیے کی مقبول اور مروّج صورت ہے تاہم دوسرے موقف سے بھی ماہیے کا مجموعی وزن بہر حال قائم رہتا ہے''۔۔۔ ان دو مثالوں سے ظاہر ہے کہ ہم لوگ ڈیڑھ مصرعی ہیئت سے بے خبر نہیں تھے لیکن ہم نے پنجابی ماہیے کی مضبوط سہ مصرعی ہیئت کو اہمیت دی۔

لگ بھگ دو سال پہلے ایک حلقے کی طرف سے مشورہ دیا گیا تھا کہ اگر ماہیے کو ڈیڑھ مصرعہ میں لکھا جائے تو ثلاثی سے اسکی الگ پہچان ہو سکے گی۔ تب میں نے جواباً لکھا تھا ''ماہیے اور ثلاثی یا ہائیکو کا محض ہم شکل ہونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ رباعی اور قطعہ بظاہر ہم شکل ہیں لیکن دونوں

کا فرق واضح ہے۔ دوہے اور دوپدے میں بسرام کی تفریق دونوں کو ہم صورت ہونے کے باوجود الگ الگ شناخت دیتی ہے۔ دِکھنے میں آزاد نظم اور نثری نظم (نثرِ لطیف) ایک جیسی ہیں لیکن فرق صاف ظاہر ہے'' (''ماہیے کی کہانی'' مطبوعہ ''گلبن'' احمد آباد ماہیا نمبر ۱۹۹۸ء)

میرے اس جواب کے معاً بعد ڈیڑھ مصرعی ہیئت کا مسئلہ حکماً پیش کیا جانے لگا ہے تو میں اس کے پس منظر کا اندازہ بھی کرسکتا ہوں۔ ماہیے کی ہیئت پر مزید بات کرنے سے پہلے یہاں مضمون نگار موصوف کے ایک ماہیے کے وزن کا جائزہ لے لیا جائے۔ میں نے شروع میں ان کا ایک ماہیا درج کیا تھا:

چکوے سے کھوری سکھی

پار کنارے پر تڑپے ہے تری چکوی

اب اسے سہ مصرعی ہیئت میں لا کر دیکھیں:

چکوے سے کھوری سکھی

پار کنارے پر

تڑپے ہے تری چکوی

موصوف کا ماہیا۔۔۔ ماہیے کے وزن پر پورا اترتا ہے ابھی تک مضمون نگار موصوف کے جتنے ماہیے بھی رسائل میں شائع ہوئے ہیں سب کے سب اسی وزن کے مطابق ہیں لیکن مضمون نگار نے اپنے مضمون میں تین مساوی الوزن مصرعوں کے مبینہ ماہیوں کو بھی ماہیے کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا یہ قول اور فعل کا تضاد نہیں ہے؟۔۔۔ راجی کی جو دُھن پیش کی گئی ہے وہ جیسی بھی ہو اگر اس پر موصوف کے ماہیے پورے اترتے ہیں تو بات تو وہیں پر ہے جہاں ہم نے ختم کی تھی۔

جہاں تک ماہیے کی تحریری ہیئت کے مسئلے کا علمی سطح پر تعلق ہے۔ اس سلسلے میں یہ جان لینا بے حد ضروری ہے کہ ماہیا پنجاب کا لوک گیت ہے جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ سفر کرتا رہا ہے۔ بیسویں صدی میں جب لوک سرمائے کو جمع کرنے کا کام شروع ہوا تب اس لوک گیت کو احاطہ تحریر

میں لایا گیا۔ پنجابی میں ماہیا تین طریقے سے تحریر کیا گیا۔ پہلے طریقے کے مطابق اسے،۔۔ پورے ماہیے کو ایک ہی مصرعہ بنا کر لکھا گیا۔

تھالی وچ کھنڈ ماہیا، کنڈھ دے کے لگنا ایں، تیری کنڈھ دی وی ٹھنڈ ماہیا

تنویر بخاری اور امین خیال نے یک مصرعی طریقۂ تحریر کی نشاندہی کی ہے۔ عاشق حسین عاشق نے تو دو سال پہلے ''نوائے وقت'' راولپنڈی میں ایک مضمون شائع کرایا تھا۔ ''ماہیے کی ہیئت اور وزن'' کے عنوان سے چھپنے والے عاشق حسین عاشق کے مضمون میں شدت کے ساتھ کہا گیا تھا کہ ماہیا ایک مصرعہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ دوسرے طریقے کے مطابق اسے ڈیڑھ مصرعہ کر کے لکھا گیا:

تھالی وچ کھنڈ ماہیا

کنڈھ دے کے لگنا ایں تیری کنڈھ دی وی ٹھنڈ ماہیا

''پنجابی ماہیا کی ہیئت اور وزن'' کے مضمون نگار اسی طرزِ تحریر پر اصرار کر رہے ہیں ۔اور تیسرے طریقے کے مطابق ماہیا تین مصرعوں میں لکھا گیا:

تھالی وچ کھنڈ ماہیا

کنڈھ دے کے لگنا ایں

تیری کنڈھ دی وی ٹھنڈ ماہیا

یہ تینوں طریقے اس صدی کے اوائل میں اختیار کئے گئے لیکن یہ تینوں طریقے ہی ماہیے جمع کرنے والوں کی ایجاد تھے۔ پنجاب کے عوام اسے کسی تحریری روپ میں نہیں، صرف ایک لَے اور سُر کے روپ میں جانتے تھے۔ جب ماہیے کو پنجابی میں تینوں ہیئتوں میں لکھا گیا ہے تو کسی ایک ہیئت کو ہی ماہیے کی اصل ہیئت کہہ کر باقیوں کو کیسے رد کیا جا سکتا ہے؟۔۔۔۔ پنجابی ادبی بورڈ لاہور، اکادمی ادبیات پاکستان اور لوک ورثہ کے قومی ادارہ نے اگر سہ مصرعی ماہیے کو اہمیت دی تھی تو اس سے ماہیے کی سہ مصرعی ہیئت کو قوت ملی ہے۔ پنجابی ماہیے کی سہ مصرعی ہیئت کے حق میں پنجابی کے ہی تنویر بخاری، ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری، علامہ غلام یعقوب انور، ڈاکٹر روشن لال

آ ہوجہ، فارغ بخاری اور امین خیال جیسے دانشور موجود ہوں تو اس موقف کو کیسے غلط کہا جا سکتا ہے۔
پھر ماہیے کی لے پر غور کریں تو اس میں بھی اتار چڑھاؤ کی تین کیفیتیں ملتی ہیں۔امین خیال نے لکھا ہے کہ گاتے وقت ماہیے کے تینوں برگ واضح ہوجاتے ہیں۔اس مسئلہ پر میں اپنے مضمون ''پنجابی لوک گیت ماہیے کی تحریری ہیئت؟''میں زیادہ تفصیل سے اپنا موقف بیان کر چکا ہوں۔اس مضمون کے آخری حصہ کو یہاں دہرا کر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

''پنجابی لوک گیت ماہیا صدیوں سے سینہ بہ سینہ رائج چلا آ رہا تھا۔اسے لکھنے کی کوئی روایت تھی ہی نہیں۔تحریری طور پر جب لوک سرمائے کو جمع کرنے کا خیال آیا تب اسے تحریری ہیئت دی گئی۔ یک مصرعی، ڈیڑھ مصرعی اور سہ مصرعی تینوں ہیئتیں مختلف اوقات میں اپنائی گئیں۔اس لئے کسی ایک کو قبول کر کے باقیوں کو رد کرنے کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔سہ مصرعی تحریری ہیئت کے بارے میں یہ ضرور کہوں گا کہ اب ماہیے کی لے سے اس کے اتار چڑھاؤ کی تین حالتوں کی نشاندہی کے بعد شواہد اس کے حق میں زیادہ ہوگئے ہیں۔گویا (۱) لے کی تین حالتوں کی بنیاد پر (۲) سہ مصرعی ہیئت میں زیادہ ہرا بھرا دِکھنے کی بنیاد پر (۳) پنجابی میں سہ مصرعی ہیئت کے بیشتر نمونوں کی بنیاد پر اور (۴) اردو میں مقبولیت کی بنیاد پر ماہیے کی سہ مصرعی تحریری ہیئت ہی مروّج ہیئت بنتی ہے۔اس کے باوجود اگر کوئی ماہیا نگار اصل وزن کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماہیے کو ڈیڑھ مصرعی ہیئت میں لکھے، چاہے ایک ہی لمبے مصرعہ کی ہیئت میں لکھے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ماہیا نے جس طرح اپنی لے کے ذریعے اپنے وزن کا تعین خود کیا ہے ایسے ہی اس کی تحریری ہیئت بھی اس کی لے کے ذریعے سے خود بخود رائج ہوتی جائیگی۔جو ہیئت اسے مناسب نہیں لگے گی ،از خود قصۂ پارینہ بن جائے گی۔ڈیڑھ مصرعی ہیئت پر بے جا اصرار کرنے والوں کو بھی اس کا یقین ہونا چاہئے''

(مطبوعہ: ماہنامہ ''سخنور'' کراچی شمارہ اپریل ۱۹۹۹ء)
(مطبوعہ ''اوراق'' لاہور جولائی اگست ۱۹۹۹ء)

میرے دو ادبی بزرگ

علامہ شارق جمال اور جناب ناوک حمزہ پوری انڈیا میں اردو کے کہنہ مشق شعراء ہیں۔ دونوں کو میں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں ''گلبن'' کے ماہیا نمبر میں مطبوعہ ان کے کوائف اور ماہیوں سے میرے دل میں ان کے لئے محبت پیدا ہوئی۔یہ محبت تا حال قائم ہے چونکہ محبت میں تھوڑی بہت چھیڑ چھاڑ جائز ہوتی ہے اس لئے دونوں بزرگوں کے ماہیے کی بحث میں ادبی رویوں کو یہاں ایک ساتھ پیش کرتا ہوں۔

ماہنامہ ''نئی شناخت'' کٹک جلد اول شمارہ دوم میں علامہ شارق جمال ناگپوری کے چند مساوی الوزن ثلاثی ''ماہیے'' کے عنوان کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔یہ تب کی بات ہے جب ابھی بھارت میں درست وزن کی تحریک کی آواز پوری طرح نہیں پہنچی تھی۔میں نے جہاں دوسرے ایسے احباب کا نوٹس لیا، وہیں علامہ شارق جمال کے ''ماہیے'' بھی بطور ماہیا تسلیم نہیں کئے۔میری کتاب ''اردو میں ماہیا نگاری'' کے صفحہ نمبر ۲۴، ۲۵ پر شارق جمال اور تین دیگر احباب کے ماہیوں کے ساتھ میرے یہ ریمارکس موجود ہیں۔

''ماہیوں میں تین یکساں وزن کے مصرعوں کی غلط روش بے خبری کے باعث عام ہوئی۔پھر اس کا ایسا بے محابا استعمال ہونے لگا کہ ہر شاعر نے من چاہا وزن گھڑ لیا۔ماہئے کے ساتھ یہ تماشہ نو آموز شاعروں نے نہیں کیا۔زیادہ تر ایسے شعراء ہیں جو ایک عرصہ سے شاعری کر رہے ہیں اور ادب کی دنیا میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔''

میرے ان اختلافی ریمارکس کو علامہ شارق جمال نے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا بلکہ اپنے طور پر ماہیے کو سمجھنے کی کوشش کی اور پنجابی ماہیے کی لے کو اصولی طور پر مانتے ہوئے اردو میں اس

کے عروضی پیمانے تلاش کئے۔انہوں نے عروضی قاعدے کے مطابق مفعول مفاعیلن کے ساتھ دوسرے مصرعہ کے لئے مفعول فعولن کا وزن تجویز کیا۔ یہ وزن عروضی قاعدے کے عین مطابق ہے لیکن ماہیے کے فطری بہاؤ میں نہیں آتا۔ ویسے کھینچ تان کر اسے لے میں لایا بھی جا سکتا ہے۔ میں نے اس وزن پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے مضمون ''اردو ماہیے کی تحریک'' میں یوں اختلاف کیا تھا۔

''شارق جمال اپنے مضمون میں تمام تر اخلاص کے باوجود ماہیے کے فطری بہاؤ کو سمجھنے کی بجائے عروضی زبان میں الجھ گئے ہیں۔ میں علم عروض میں ان کی مہارت کا معترف بھی ہوں اور قدر دان بھی، اور اس وجہ سے بھی ان سے محبت رکھتا ہوں کہ انہوں نے ماہیے کے غلط وزن کو ترک کرکے درست وزن کو اپنا کر عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے تاہم اپنے مضمون میں انہوں نے عروضی قاعدے کی بنیاد پر ماہیے کا جو وزن تجویز کیا ہے وہ ماہیے کے فطری بہاؤ میں نہیں آرہا''

(ماہنامہ سخنور کراچی۔دسمبر ۱۹۹۸ء)

عروضی قواعد کی رو سے اپنے موقف میں حق بجانب ہونے کے باوجود علامہ شارق جمال نے اس اختلاف کو بھی اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور سہ ماہی ''کوہسار جرنل'' بھاگل پور کے شمارہ مارچ ۱۹۹۹ء میں ''ماہیا۔ایک مباحثہ'' کے تحت ماہیے کے تئیں پورے اخلاص کے ساتھ کہہ دیا کہ ''مساوی الوزن ماہیے تو کسی طرح ماہیے کے فارم میں نہیں آسکتے۔ ہاں، پہلے مصرعہ کے ارکان مفعول مفاعیلن کے ساتھ دوسرے مصرعہ کے ارکان فاع مفاعیلن یا مفعول فعولن وزن اچھا لگتا ہے۔کئی طرح کے وزن سے بہتر ہے کہ انہیں ارکان میں ماہیے کہے جائیں۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ شروع میں رکن فاع کا رکھنا عروضی قاعدے کے خلاف ہے لیکن آج کے لکھنے والوں کا اتفاق وزن فاع مفاعیلن پر ہی ہے تو بہتر ہے اسی ایک وزن ہی کو رواج دیا جائے۔ ماہیے تخلیق کرنے والوں کی تعداد بتاتی ہے کہ اس صنف سخن کو کافی شہرت ملے گی۔آج بھی اسے جو شہرت ملی ہے وہ دوسری اصناف شاعری سے (غزل وغیرہ کو چھوڑ کر) زیادہ ہی ہے۔''

ماہیے کے سلسلہ میں علامہ شارق جمال کے رویے سے ظاہر ہے کہ انہوں نے ماہیے کو

بتدریج سمجھنے کے ساتھ اس کے عروضی خدوخال کو اجاگر کرنے کی مخلصانہ کاوش کی ہے۔ اس سارے تدریجی عمل میں ان کی شخصیت کا قلندرانہ رخ بھی سامنے آیا ہے کہ اس بحث میں انہوں نے فقیرانہ شان استغناء کے ساتھ اپنی انا کو بیچ میں نہیں آنے دیا اور جو ادبی سچائی محسوس ہوئی اسے خلوص کے ساتھ مان لیا۔

جناب ناوک حمزہ پوری نے ماہیے کی تفہیم میں ایک بڑی اہم اور بنیادی نوعیت کی بات تحریر کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں ''میں بھی اس امر کی تائید کرتا ہوں کہ عروض کو آہنگ کا تابع ہونا چاہئے نہ کہ آہنگ ہی کو عروض کا غلام بنا دیا جائے۔''

لگ بھگ اسی مفہوم کو انہوں نے اپنے مضمون ''ماہیے کا وزن'' مطبوعہ دو ماہی گلبن احمد آباد شمارہ ستمبر اکتوبر ۱۹۹۸ء میں بھی دہرایا ہے۔ یوں اصولی طور پر ناوک حمزہ پوری ماہیے کی لوک لے کے حامی ہیں لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے لکھنا پڑ رہا ہے کہ ان کی طرف سے ماہیے کی بحث میں کہیں کسی کی بے جا طرفداری اور کہیں کسی پر بے جا طنز کا رویہ ابھرنے لگا ہے۔ بے جا طرفداری میں ظہیر غازی پوری صاحب ان کی کمزوری محسوس ہونے لگے ہیں۔ظہیر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں خاصی عروضی کاری گری دکھائی تھی۔ دوسرے لوگوں کا مضحکہ اڑایا تھا۔ان کی عروضی کاریگری کے جواب میں احمد حسین مجاہد نے مضمون ''اردو ماہیا عروضی تناظر میں'' تحریر کیا جو گلبن کے شمارہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۸ء میں چھپ چکا ہے۔اس کے بعد ناوک صاحب کا جو خط گلبن کے شمارہ نومبر، دسمبر ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا ہے اس میں انہوں نے احمد حسین مجاہد صاحب کے مضمون پر اپنی اچھی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ظہیر صاحب کا ذکر ہی گول کر دیا ہے اور زیر بحث بات کو چھوڑ کر شارق جمال صاحب پر طنز کرنے لگے اور اس میں یہ بھی لکھ دیا۔

''طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان کے پیش کردہ وزن کو خود حیدر قریشی صاحب نے مسترد کر دیا ہے''

احمد حسین مجاہد نے ظہیر صاحب کی ''عروضی مہارت'' کو اپنے مضمون میں ظاہر کر دیا تھا۔شاید ان سے توجہ ہٹانے کے لئے ضروری تھا کہ تیر کا رخ شارق جمال صاحب کی طرف کر دیا جائے۔ظہیر صاحب بھی بھلے آدمی ہیں۔ اپنی کسی مجبوری یا غرض کے باعث ماہیے کی بحث میں

انہوں نے علمی بات ایک فیصد کی ہے اور سنی سنائی باتوں اور مخالفین کے بہتانوں کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔نتیجتاً ان کی اپنی ادبی ساکھ خراب ہوئی ہے۔اب تو وہ اسی بات سے خوش ہو رہے ہیں کہ انہیں کسی دوست نے خط لکھ دیا ہے کہ ماہیے کا تجربہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ماہیے کے سلسلے میں کتنے مخلص تھے۔کبھی کبھی انسان کو اپنی مجبوریوں کے باعث ایسا بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔بہرحال میں تو ظہیر صاحب کے لئے بھی خیر خواہی کے جذبات رکھتا ہوں۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔تاہم اس سارے بحث مباحثہ میں ناوک حمزہ پوری صاحب کی شخصیت کا جو پہلو سامنے آیا ہے اس سے میرے اس تصور کو ہلکی سی، بہت ہی ہلکی سی ٹھیس پہنچی ہے جو ان کے بارے میں میرے ذہن میں بنا ہوا ہے۔مجھے شارق جمال صاحب اور ناوک صاحب کی بزرگانہ شخصیات ایک جیسی لگتی ہیں۔اسی لئے یہ چھوٹی سی شکایت لکھ دی ہے۔ڈاکٹر مناظر ہوں، ظہیر ہوں یا حیدر قریشی۔ہم سب کی بات اور ہے۔میں دعا کرتا ہوں کہ اپنے دونوں بزرگوں علامہ شارق جمال اور جناب ناوک حمزہ پوری کے بارے میں میرے ذہن میں جو تصور بنا ہوا ہے اور دل میں جو تصویر بنی ہوئی ہے وہ ہمیشہ قائم رہے اور وہ ہماری کوتاہیوں کے باوجود ہماری رہنمائی کرتے رہیں۔

ہمارے لئے دونوں بزرگوں کا وجود تبرک کا درجہ رکھتا ہے۔

(مطبوعہ سہ ماہی اسباق پونہ۔جولائی تا ستمبر ۱۹۹۹ء)

مزید کچھ ماہیے کے بارے میں

سہ ماہی ''کوہسار'' بھاگل پور کے شمارہ مارچ ۱۹۹۹ء میں ممتاز شاعر قتیل شفائی کا مضمون '' کچھ ماہیے کے بارے میں'' پڑھ کر خوشی ہوئی۔انہوں نے بالو اور ماہیا کے کرداروں کے بارے میں عمدہ معلومات فراہم کی ہے۔اسی معلومات میں اضافہ کرنے کیلئے میں بھی مزید کچھ مواد پیش کر رہا ہوں۔اقبال بیگم گجرات (پاکستانی شہر) کے ایک معزز وکیل کی بیٹی تھی۔اقبال نام کی نسبت سے اسے بالو کہتے ہیں اور اس کا بالو نام ہی مقبول ہو گیا۔ماہنامہ ''شمع'' نئی دہلی کے فلم اور ٹی وی نمبر (۱۹۸۸ء) میں پاکستانی فلمی صحافی یاسین گوریجہ صاحب کے مضمون ''فلم۔شمالی ہند سے پاکستان تک'' میں یہ معلومات ملتی ہیں۔

''بالو کا اصلی نام اقبال بیگم تھا۔وہ گجرات کے ایک وکیل کی بیٹی تھی جسے ایک تانگے والا اغوا کر کے لے گیا تھا یا وہ خود اس تانگے والے کے ساتھ فرار ہو کر کلکتہ پہنچ گئی تھی۔ان دنوں وہ اسٹیج پر کام کر رہی تھیں۔تانگے والے کا نام محمد علی عرف ماہیا تھا۔ریہرسل میں بالو کو ہیروئن کے طور پر لیا گیا۔اس کے ساتھ بی این بالی، حیدر باندی، بے بی نور جہاں، حسن دین وغیرہ نے کام کیا۔اس فلم کی شوٹنگ کے دوران پنجاب کے وزیر اعلیٰ سکندر حیات خان بھی سیٹ پر آئے۔انہوں نے، کے ڈی مہرہ کی کوشش کو سراہا۔''ہیر سیال'' نے زبردست کامیابی حاصل کی۔پنجاب میں ۱۹۳۶ء میں یہ فلم ریلیز ہوئی اور ہر جگہ اس نے سلور جوبلی منائی۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بالو اور محمد علی ماہیا کا رومانس بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے پہلے نصف کا حصہ ہے۔اسی مضمون میں آگے چل کر یاسین گوریجہ فلم ''سسی پنوں'' کے ذکر میں لکھتے ہیں۔''اسے داؤد چاند نے ڈائریکٹ کیا تھا۔''ہیر سیال'' والی بالو اس فلم کی ہیروئن تھی۔

اس فلم کی کامیابی کے بعد بالو بیمار رہنے لگی۔اس کے خاوند محمد علی ماہیا نے اسے کلکتہ کے بازارحسن کی زینت بنا دیا۔یہیں وہ آتشک کی بیماری میں مبتلا ہوکر اللہ کو پیاری ہوگئی۔البتہ وہ ایک ایسی یادگار چھوڑ گئی جس نے بعد میں پاکستان کی صف اول کی ہیروئن بن کر نام پیدا کیا۔اس ہیروئن کا نام صبیحہ خانم ہے“۔۔۔۔قتیل شفائی صاحب نے بالو کی بیماری ٹی بی بیان کی ہے جو درست ہوسکتی ہے۔یاسین گوریجہ کے اس بیان سے کہ ”فلم کی کامیابی کے بعد بالو بیمار رہنے لگی“ ٹی بی کا قیاس درست ہوسکتا ہے۔البتہ جب اسے بازارحسن میں بٹھا دیا گیا تو پھر اسے آتشک کی بیماری بھی لگ گئی۔میرا خیال ہے ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکالنے کے بعد مقدمہ بازی اور پھر سکینڈل کی تشہیر نے بالو کو اندر ہی اندر کچوکے لگائے ہوں گے۔یہی اذیت ٹی بی کا باعث بنی ہوگی۔بازارحسن نے آتشک کا موذی مرض دے دیا اور یوں پانچ چھ سال کے مختصر سے عرصہ میں وہ گھر سے فرار کے بعد شہرت اور رسوائی سمیٹ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔اس سارے سانحہ میں یہ ایک روشن پہلو بھی ہے کہ اقبال بیگم ایک شریف خاندان کی اولاد ہوکر کوٹھے تک جا پہنچی لیکن اس کی بیٹی صبیحہ خانم نے کوٹھے سے فلم اور فلم سے اپنا گھر آباد کرنے کا سفر مکمل کیا۔بالو وکیل کی بیٹی تھی۔اعزاز احمد آذر کا یہ ماہیا بالو کے نام کے بغیر بھی بالو ہی کے ذکر سے بھرا ہوا لگتا ہے۔

اس میں بھی ہیں راز کئی
لڑکی وکیلوں کی
دے گئی تاریخ نئی

محمد علی اور اقبال بیگم کے معاشقے کے حوالے سے امین خیال جی نے اپنے مضمون ”پنجابی ماہیا“ میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔محمد شفیع اور ایک اور بالو کی عشق کی داستان کا ذکر بھی کیا ہے۔تاہم یہ سارے قصے اسی صدی کے اوائل کے ہیں جبکہ لوک گیت ماہیا تو صدیوں سے پنجابی عوام میں رائج ہوا ہے۔

حال ہی میں مغربی ممالک میں کارنیوال کے جشن منائے گئے ہیں۔جرمنی میں اس

میلے کو فاشنگ کہتے ہیں اور صرف جرمنی میں ہی۔۔۔سارے یورپ میں سے صرف جرمنی میں اس موقع پر Bütten Reden لازماً ہوتی ہے۔ مجھے اس کا قطعاً علم نہیں تھا۔ جرمنی میں مقیم میرے دوست ارشاد ہاشمی نے ایک بار مجھ سے سرسری سا ذکر کیا کہ یہاں جرمنی میں بھی ماہیے سے ملتی جلتی شاعری پائی جاتی ہے۔اتفاق سے اس دن ارشاد ہاشمی صاحب بھی میرے ہاں موجود تھے جب ایک جرمن خاتون میرے ایک پرانے شاگرد کے ساتھ مجھے ملنے کے لئے تشریف لائیں۔ Frau Häring سے ہم نے Bütt کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔دو مصرعوں میں بھی، تین مصرعوں میں بھی اور اس سے زیادہ مصرعوں میں بھی۔پھر انہوں نے جرمنی کے مختلف علاقوں کی فاشنگ کی تقریبات کی الگ الگ ثقافتی پہچان پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ تھوڑے تھوڑے سے فرق کے باوجود Bütt پڑھنے کا رواج سارے علاقوں میں ہے اور اس کے بغیر یہ تقریب مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔Frau Häring نے بتایا کہ صدیوں پرانی مختلف علاقوں کی ثقافتی پہچان اب ایک مرکزی ثقافتی پہچان میں ڈھلتی جارہی ہے۔یہ ساری دلچسپ باتیں تھیں لیکن مجھے تو Bütt کی تلاش تھی۔اس معاملے میں بھی ارشاد ہاشمی صاحب بازی لے گئے۔ایک دن وہ چند Bütt لے کر آئے۔میں نے انہیں دیکھا تو حیران رہ گیا۔انہیں پنجابی اور اردو ماہیے سے گہری مشابہت تھی۔ارشاد ہاشمی صاحب کے فراہم کردہ Bütt انہیں کے اردو ترجمہ کے ساتھ پیش ہیں۔

افسر وہ سیانا ہے　　Burgermeister ist sehr schlou
کام کا زور ہو تو　　Wen Viel Zu Tun Ist
کر لیتا بہانہ ہے　　Macht er oft bluou

تھا شوق اسے جتنا　　Er Wolte ran
دیکھئے کام وہ اب　　Jetz muf zeigen
کر سکتا ہے کتنا　　was er kann

ارشاد ہاشمی صاحب نے خود بھی جرمن زبان میں ایک ماہیا کہا۔جرمن زبان میں اسے

پہلا ماہیا کہنا چاہئے لیکن شاید جرمن احباب اسی ماہئے کو Bütt کہیں گے۔

Es gibt nicht zu lachen

Auslander kommen

Hier mub souber machen

بعد میں Frau Häring نے مجھے ڈھیرے سارے Bütt فراہم کر دیئے۔ ان میں مصرعوں کی تعداد مختلف ہے لیکن سہ مصرعی فارم کے Bütt حیرت انگیز طور پر ماہیے جیسے لگتے ہیں۔ ابھی ان پر غور کر رہا ہوں۔ Frau Häring اور ارشاد ہاشمی صاحب نے ساتھ دیا تو ہم ماہیے جیسے بہت سارے Bütt دوسروں سے الگ کر کے یک جا کر سکیں گے۔ شاید!

ماہئے کی بحث کے سلسلے میں سب سے پہلا باقاعدہ مضمون افتخار احمد نے ''اردو ماہیے'' کے زیر عنوان لکھا تھا۔ یہ مضمون دو ادبی رسائل میں یکے بعد دیگرے شائع ہوا تھا۔ ماہنامہ ''صریر'' کراچی کے شمارہ اگست ۱۹۹۲ء میں اور ماہنامہ تجدید نو اسلام آباد کے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں۔ ان دونوں رسائل کا ماہیے کی تحریک کا آغاز کرنے میں تاریخی کردار بنتا ہے۔ تاہم تحقیقی زاویے سے یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ مذکورہ مضمون سب سے پہلے روزنامہ ''نوائے وقت'' راولپنڈی کی اشاعت ۲۴ مئی ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ تب اس کے ادبی صفحہ کے مدیر انوار فیروز تھے۔ سو ماہیے کی بحث کا سب سے پہلا مضمون روزنامہ ''نوائے وقت'' راولپنڈی میں جناب انوار فیروز کی زیر نگرانی شائع ہوا۔ آپ خود بھی ایک عمدہ ماہیا نگار ہیں۔ امید ہے یہ ساری باتیں ماہیے سے دلچسپی رکھنے والے دوستوں کے لئے دلچسپی کا باعث بنیں گی۔

(مطبوعہ سہ ماہی کوہسار بھاگلپور۔ اگست ۱۹۹۹ء)

اردو ماہیے کو بساتے ہوئے شہر اور بستیاں

اردو ماہیے کو اردو دنیا میں جو حالیہ مقبولیت ملی ہے اس کے نتیجہ میں ماہیے کے موضوعات میں وسعت آ رہی ہے بعض ایسے موضوعات جو ماہیے کی لوک روایت کا حصہ رہے ہیں اردو میں نہ صرف انہیں اپنایا گیا بلکہ ان میں لوک روایت سے آگے کا سفر بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ پنجابی ماہیے میں مختلف حوالوں سے شہروں اور دیہاتوں کا ذکر ملتا ہے چند مثالیں پیش ہیں۔

۱۔ ڈھارے دی کنڈی آ
منڈیا لہور دیا
تیری اکھ بڑی گنڈی آ

۲۔ باگ وچ لاڈیرا
منڈیا لہور دیا
عتبار نہیں تیرا

۳۔ بدوملہی نوں جانواں گے
ماہی ساڈا کالے رنگ کا
اونہوں قلعی دی کرانواں گے

۴۔ بدوملہی نوں جانواں گے
ماہی دیاں لمیاں مُچھاں
اوتھوں وان وٹانواں گے

۵۔ سُنیا ایں چنڈ راہناں
چُن کے لُٹیا ای
تاہیوں غیراں وچ پھُنڈ باہناں

ان ماہیوں میں لاہور، بدوملہی اور چنیوٹ کے قریب ایک گاؤں چنڈ کا ذکر ملتا ہے پنجابی ماہیے کی یہ روایت از خود اور وسیع پیمانے پر اردو ماہیے میں در آئی ہے متعدد شہروں اور بستیوں کے ناموں سے اردو ماہیا بستا اور آباد ہوتا جا رہا ہے اس وقت مجھے جو رسائل، اخبارات اور کتب دستیاب ہیں ان میں بھی شہروں، بستیوں اور ملکوں کا ذکرِ فراواں ملتا ہے سو اپنے اس مضمون میں مختلف ماہیا نگاروں کے ایسے ماہیے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

دینی ماہیوں میں مدینہ منورہ کا خاصا ذکر ہوا ہے ان میں مدینہ شریف سے آنحضرت ﷺ کی نسبت کے حوالے سے گہری محبت اور عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔

اُس اوراجالے ہیں
جائیں مدینے جو
وہ قسمت والے ہیں
(سعید شباب)

اک بات ہے سینے میں
جان مری نکلے
مولا کے مدینے میں
(قاضی اعجاز محور)

روزوں کامہینہ ہے
میری آنکھوں کا
مسکن وہ مدینہ ہے
(عارف فرہاد)

☆ ☆ ☆

مرکز گنجینے کا
شہروں میں افضل
ہے شہر مدینے کا
(امین خیال)

روشن ساستارہ ہے
شہر مدینہ میں
جنت کا نظارہ ہے
(شاہدہ ناز)

بھرلاؤ سینے میں
نور برستا ہے
آقاؐ کے مدینے میں
(اختر رضا سلیمی)

مدینہ شہر کے حوالے سے تو بے شمار ماہیے کہے جا چکے ہیں تاہم بعض ماہیوں میں مکہ شریف کا ذکر بھی مدینہ شریف کے ساتھ آیا ہے۔

اک سبز نگینہ ہے
مرکز دنیا کا
مکہ یامدینہ ہے
(اجمل جنڈیالوی)

اب دور سفینہ ہے
پھر بھی مرے دل میں
مکہ ہے، مدینہ ہے
(علقمہ شبلی)

دل مکہ مدینہ ہو
نورالٰہی سے
روشن ہر سینہ ہو
(محمد وسیم انجم)

یہاں تک تو مکہ اور مدینہ کا ذکر تھا بخش لائل پوری کے ایک ماہیے میں کاشی اور مدینہ کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے

کاشی ہومدینہ ہو
سجدے لاحاصل
جب پاک نہ سینہ ہو

☆

بخش لائل پوری نے قلب کی صفائی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے تو ضمیر یوسف نے برملا کہا ہے:

نفرت ہے نہ کینہ ہے
پاک ہے ہر گوشہ
دل میرا مدینہ ہے

☆

نذیر فتح پوری کے ہاں اجمیر شریف کا حوالہ اولیائے کرام سے ان کی عقیدت کو ظاہر کرتا ہے:

اجمیر میں جا سجنی
پریم کے ساگر سے
دل اپنا لگا سجنی

بنارس کی صبح کا حوالہ اایک طرف گنگا کی مذہبی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے تو دوسری طرف اس کا حُسن ،محبوب کے حسن کی تشبیہ بن جاتا ہے۔

بہتا ہے سرن ڈھولا
صبح بنارس کی
تو پہلی کرن ڈھولا (یوسف اختر)

تاریکی زنداں ہوں
صبح بنارس تُو
میں شام غریباں ہوں (شجاعت علی راہی)

کراچی ،ملتان اور لاہور کا ذکر بعض ماہیا نگاروں کے داخلی تجربوں سے یوں ماہیے میں آیا ہے۔

رنگ گوراڈاچی کا
دیکھو کرڈالا
کیا حال کراچی کا
(صابر آفاقی)

ملتان کے آم اچھے
اچھا لگتا ہے
جس شخص کے کام اچھے
(صابر آفاقی)

وہ دور نہیں دیکھا
ہم نے بزرگوں کا
لاہور نہیں دیکھا
(پروین کمار اشک)

ملتان، دلی اور راولپنڈی کا تذکرہ بہ انداز دگر یوں ملتا ہے۔

یہ ناز سے کہتا ہوں
پیروں کی نگری
ملتان میں رہتا ہوں
(ارشد اقبال آرش)

پردیس میں رہتے ہیں
دلی کے جنگل میں
دُکھ پنڈی کے سہتے ہیں
(پروین کمار اشک)

شہروں کی کہانی ہے
لڑکا پنڈی کا
لڑکی ملتانی ہے
(خاور اعجاز)

عارف فرہاد کے ماہیوں میں راولپنڈی پتھر دل صنم کا شہر بن کر ابھرتا ہے۔

دل کے لئے غم ڈھونڈے
راولپنڈی میں
کیا کوئی صنم ڈھونڈے

عمروں کے روگ ملے
پنڈی میں دل کو
پتھریلے لوگ ملے

اس کے برعکس کابل کا محبوب عارف فرہاد کو زیادہ مرغوب ہے لیکن بالآخر وہ نوشہرہ کی خوشبو سے مشام جاں کو معطر کر لیتے ہیں۔

کابل سے ہوا آئی
بہتے دریا میں
پھولوں کو بہا لائی

چاندی کی کٹوری ہے
کابل کی لڑکی
ہر چیز سے گوری ہے

چمبیلی کی کلیوں میں
خوشبو رہتی ہے
نوشہرہ کی گلیوں میں

ڈاکٹر صابر آفاقی نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی ماہیے کے لئے خدمات کو محبت کی نظر سے دیکھا تو مناظر عاشق کے علاقہ برہ پورہ کا ذکر یوں آفاقی صاحب کے ماہیے میں چلا آیا:

اک دریا بہتا ہے
عاشق ماہیے کا
برہ پورہ میں رہتا ہے

بعض شہروں اور وادیوں کا ذکر اردو ماہیے میں اس طرح آیا ہے:

مدہوش نظارے ہیں
لوگ پشاور کے
جی دار ہیں، پیارے ہیں

اک راگ روانی میں
پیار کا نغمہ ہے
جہلم کے پانی میں
(مسعود ہاشمی)

یہ گوجرانوالہ ہے
شہر محبت کا
ہر شخص نرالا ہے
(امین خیال)

جہلم ترے دھاروں کی
بھول نہیں سکتے
ہم آگ چناروں کی
(یوسف اختر)

چنبیلی کی کلیوں میں
گم ہے مرا بچپن
گجرات کی گلیوں میں
(عاصی کاشمیری)

☆ ☆ ☆

چترال کو چلتے ہیں
سنگ پہاڑوں کے
جہاں رنگ بدلتے ہیں
(امین خیال)

گرمی سے نہ گھبرانا
جب کبھی دل چاہے
کاغان چلے آنا
(سلطان سکون)

کشمیر میں رہتا ہوں
کشمیری رنگ میں
میں ماہیے کہتا ہوں
(صابر آفاقی)

☆ ☆ ☆

شملے کا دسمبر ہے
رات کٹے کیسے
پردیس میں دلبر ہے
(شباب للت)

جھرنا کشمیر کا ہے
کس سے کریں شکوہ
قصہ تقدیر کا ہے
(جاوید خان)

لو ٹوٹ گیا سپنا
بالاکوٹ میں بھی
اب کوئی نہیں اپنا
(احمد حسین مجاہد)

ناراں کی ہوائیں ہیں
طعنے ہیں یاروں کے
اور تیری جفائیں ہیں
(احمد حسین مجاہد)

بجلی سی لپک جائے
سربن وادی کو
کرنوں کی سڑک جائے
(آصف ثاقب)

ابھی تک تو شہروں کی بات ہو رہی تھی اردو ماہیے میں بعض ماہیا نگاروں کی ذات کے حوالے سے ان کے دیہاتوں کا ذکر بھی ملتا ہے یوں گوہاڑی، جھنگی اور کیکوٹ جیسے گم نام گاؤں بھی اردو ماہیے کو آباد کرنے لگے ہیں۔

کیا تیز کلہاڑی ہے
جس گاؤں جنما
نام اس کا گوہاڑی ہے
(صابر آفاقی)

دکھ درد ہی سہتا ہوں
ہوں کیکوٹ کا اور
پنڈی میں رہتا ہوں
(اختر رضا سلیمی)

جھنگی کی وادی ہے
ہم بھی گئے تھے سجن
عارف کی شادی میں
(اختر رضا سلیمی)

ایک طرف اردو ماہیے میں غیر معروف دیہاتوں تک کے نام آرہے ہیں تو دوسری طرف یورپی ممالک کے معروف شہروں کی رونقوں سے بھی ماہیا سجنے لگا ہے اس سلسلے میں سجاد مرزا کی یورپ کی سیاحت ان کے کام آئی ہے۔ان کے چند ماہیے دیکھیں:

کولون کے فوارے
دل میں سمائے ہیں
برسات کے نظارے

وہ بون کی شاہراہیں
چھوڑ کے مرزا جی
کیوں بھرتے ہیں اب آہیں

لندن کے حسیں چہرے
دیس میں مرزا کو
رہتے ہیں سدا گھیرے

پیرس کی ہے دوشیزہ
ہاتھ میں چھتری کا
اک پھول ہے پاکیزہ

ڈاکٹر صابر آفاقی آسٹریلیا کی سیاحت کے بعد وہاں کی یادوں کو یوں سینے سے لگائے ہوئے ہیں:

رنگین بہاروں کو
بھول نہیں سکتا
سڈنی کے نظاروں کو

ان شہروں کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک کے نام بھی ڈاکٹر صابر آفاقی ،سجاد مرزا اور جاوید خان کے ماہیوں میں آئے ہیں:

وہ حُسن وہ رعنائی
ایک حسیں دیکھا
نیپال کی یاد آئی
(صابر آفاقی)

طوفان میں رہتا ہے
اپنا حیدرآباد
المان میں رہتا ہے
(صابر آفاقی)

اٹلی کے حسیں لوگو
دل میں رہو بستے
تم بولو کہ نہ بولو
(سجاد مرزا)

جب سے ہیں سجن من میں
دل ہی نہیں لگتا
اب مغربی جرمن میں
(جاوید خان)

امین خیال کے ماہیوں میں پاکستان کے ساتھ جرمن، انگلینڈ، جاپان اور چین کا ذکر ان کے کسی نہ کسی شخصی حوالے سے آیا ہے۔

اک چاند اک تارہ ہے
پاکستان مجھے
جند جان سے پیارا ہے

رحمت کی پڑی جھالیں
پاکستان کو بھی
سرسبز بنا ڈالیں گے

گھوڑے پر زین پڑے
حاصل علم کرو
گو جانا چین پڑے

جرمن کی فوجیں ہیں
امن اگر ہو تو
موجیں ہی موجیں ہیں

جاپان میں رہتے ہو
درد جدائی کے
تم کیسے سہتے ہو

انگلینڈ نہ جا بیٹا
اپنے دیس میں رہ
تو آدھی کھا بیٹا

اس مضمون میں پیش کئے گئے سارے ماہیوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پنجابی ماہیے میں شہروں اور دیہاتوں کا حوالہ اردو ماہیے میں نہ صرف خوبصورتی سے آیا ہے بلکہ اس میں پنجابی روایت سے آگے کا سفر بھی دکھائی دیتا ہے۔ملکوں،شہروں،قصبوں اور دیہاتوں کے ایسے ذکر سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ماہیا پوری طرح ارضی اور ثقافتی بنیاد سے جڑا ہوا ہے۔ ہمارے ادب کی مختلف اصناف میں تجریدیت کی بے معنی ماورائیت کے برعکس ماہیے نے اس طرح ادب میں ارضی، ثقافتی،جسمانی اور بامعنی تخلیقیت کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کی کاوش کی ہے مجھے امید ہے کہ اردو ماہیا اپنی ثقافتی قوت کے بل پر ہمارے ادب میں اس مثبت رویے کو فروغ دینے کا موجب بنے گا۔آخر میں اسی موضوع سے متعلق اپنے چند ماہیے میں پیش کئے دیتا ہوں

یادوں کے خزینے میں
خانپور اپنا تو
آباد ہے سینے میں

اک روح تھی سیلانی
چھوڑ کے شہر دل
جو ہو گئی ملتانی

اک اپنا ہزارہ تھا
کتنے مناظر کا
خوش رنگ نظارہ تھا

☆ ☆ ☆

مولا کی عنایت تھی
اپنے مقدر میں
جرمن کی ولایت تھی

خود کار نظام ملے
جرمنی میں آکر
کتنے آرام ملے

دل شہر مدینہ ہو
نور محبت سے
روشن ہر سینہ ہو

(مطبوعہ ماہنامہ ’’نیرنگ خیال‘‘ راولپنڈی۔ماہیا نمبر اکتوبر 1999ء)

ماہیے کے فروغ میں خواتین کا حصہ

اردو شاعری کی نئی اصناف میں ماہیا نے نہ صرف اپنی پہچان واضح کی ہے بلکہ ادبی اور عوامی دونوں سطح پر مقبولیت بھی حاصل کی ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اپنے ادبی خدو خال کے ساتھ نمایاں ہونے والی اس شعری صنف کی بنیاد پنجابی لوک گیت ماہیا ہے۔ پنجابی ثقافت کے تناظر میں دیکھا جائے تو ماہیے میں عورت کی آواز مرد کے مقابلے میں زیادہ ابھری ہے۔ اس کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شادی بیاہ اور دوسری گھریلو تقریبات میں رنگ جمانے کے لئے خواتین ماہیے گاتی ہیں، اسی لئے پنجابی ماہیے میں عورت کی آواز زیادہ طاقتور محسوس ہوتی ہے۔ دیگر وجوہات میں سے ایک اور اہم وجہ ''قدیم ہندی گیت'' کی روایت ہے۔ قدیم ہندی گیت کی صنف بقول ڈاکٹر وزیر آغا بذات خود عورت کی ''پکار'' ہے۔ عورت کا جذبۂ آزادی، محبت کا اظہار اور دل کی پکار ہے۔ سو ہندی گیت کے بیشتر اوصاف ماہیے کی لوک روایت میں موجود ہیں۔

اردو ماہیے کے فروغ میں ماہیا نگار خواتین کا قابل قدر حصہ ہے۔ ماہیے کی بحث کے حوالے سے شاہدہ ناز، غزالہ طلعت، ثریا شہاب، ڈاکٹر جمیلہ عرشی، نصرت یاسمین اور شگفتہ الطاف، کے مضامین سامنے آئے۔ ان میں 'ماہیے کی بحث کا منظر نامہ'، شاہدہ ناز 'ماہیے کی ہیئت اور وزن' از غزالہ طلعت اور 'گلبن کا ماہیا نمبر' از ثریا شہاب 'عالمی تناظر میں اردو ماہیے پر ایک طائرانہ نظر' از ڈاکٹر جمیلہ عرشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شگفتہ الطاف نے میری ماہیا نگاری کو موضوع بنایا ہے۔ منزہ اختر شاد نے مضمون تو نہیں لکھا لیکن ماہنامہ ''صریر'' میں چھپنے والا ان کا ایک خط ماہیے کی بحث میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ نصرت یاسمین نے 'ماہیا، اردو ماہیا اور ضمیر اظہر'

میں اپنی تنقیدی بصیرت کا اظہار کیا ہے۔ ان سب خواتین کے ساتھ منزہ یاسمین نے بھاولپور سے اور صبیحہ خورشید نے ناگپور سے یونیورسٹی لیول کا جو کام کیا ہے وہ اپنی اہمیت وافادیت کے لحاظ سے باقی سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ منزہ یاسمین کا کام تو ماہیے پر میرے مجموعی کام تک محدود ہے، جبکہ صبیحہ خورشید نے اردو ماہیے کے پورے منظر نامہ کو اس کے پنجابی پس منظر تک جا کر گہرائی کے ساتھ دیکھا ہے۔

ماہیا نگاری میں بھی خواتین تخلیقی لحاظ سے سرگرم عمل ہیں۔ ابتدائی ماہیا نگار خواتین میں غزالہ طلعت، فرحت نواز اور منزہ اختر شاد کے نام شامل ہیں تاہم یہ خواتین ماہیا نگاری کو باقاعدگی سے جاری نہیں رکھ سکیں، غالباً اس کی وجہ گھریلو مصروفیات ہیں۔

شادی کے جھمیلے میں
شعر و ادب چھوٹا
بس ایک ہی ریلے میں
(غزالہ طلعت)

ان کے بعد شاہدہ ناز، صدف جعفری اور بسمہ طاہر ماہیا نگاری کی طرف مائل ہوئیں۔ ان میں بسمہ طاہر مطلع ادب سے جلد ہی غائب ہوگئیں۔ صدف جعفری تین ہم وزن مصرعوں کے ثلاثی چھوڑ کر پنجابی لے کی بنیاد پر ماہیے کہنے لگی تھیں لیکن اصلاً وہ لے کی بجائے عروضی حساب سے ماہیے کہہ رہی تھیں۔ بار بار لڑکھڑا جاتیں چنانچہ لے کی پابندی ملحوظ نہ رکھ پانے کے باعث پھر وہ تین ہم وزن مصرعوں کی عافیت گاہ میں لوٹ گئیں۔ شاہدہ ناز اس لحاظ سے پہلی ماہیا نگار خاتون ہیں جنھوں نے تخلیقی لگن کے ساتھ مسلسل ماہیے کہے۔ غالباً اب ان کے ماہیوں کا مجموعہ تیار ہوسکتا ہے۔ شاہدہ ناز کے بعد ثریا شہاب، سلطانہ مہر اور عذرا اصغر جیسی شاعرات نے ماہیے کو وقار عطا کیا۔ یاسمین سحر اور پرزرق صنم کے ماہیوں نے اردو ماہیے کو پنجاب رنگ سے آمیز کرنے کی کاوش کی جبکہ شبہ طراز، کوثر بلوچ، یاسمین مبارک، نازیہ رحمان، اختر بانو ناز، مطلوب بی بی اور نزہت سمن کے ماہیوں سے اردو ماہیے کی تحریک کو بڑھاوا ملا۔ ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار بشریٰ رحمٰن نے بھی اردو

ماہیے کہے ہیں اور جب کہنے کی طرف آئی ہیں تو ڈھیروں ڈھیر ماہیے کہہ دیئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ماہیے کی طرف ان کی آمد سے اردو ماہیے کو مزید وقار اور اعتبار ملے گا۔ بشریٰ رحمٰن کی طرح ترنم ریاض نے بھی ماہیا نگاری کی طرف توجہ کی تو پنجابی لَے اور پنجابی رَس کے ماہیوں کے انبار لگا دیئے۔ بشریٰ رحمٰن اور ترنم ریاض کی ماہیا نگاری کے دوران برمنگھم سے رضیہ اسماعیل، سری نگر سے نسرین نقاش، گوجرانوالہ سے ریحانہ سرور اور اسلام آباد سے ثروت محی الدین نے کمال کر دکھایا کہ چاروں نے نہ صرف ماہیا نگاری کی طرف خصوصی توجہ کی بلکہ اتنے ماہیے کہہ لئے کہ اپنے ماہیوں کے مجموعے ترتیب دے کر شائع کر دیئے۔ رضیہ اسماعیل کا مجموعہ ’پیپل کی چھاؤں میں‘، ریحانہ سرور کا مجموعہ ’دل کے کاغذ پر‘، ثروت محی الدین کا مجموعہ ’دو پھول کھلے ماہیا‘ اور نسرین نقاش کا مجموعہ ’روجیں چناب‘ کی شائع ہو چکے ہیں۔ شاہدہ ناز، ترنم ریاض اور بشریٰ رحمٰن کے بھی اتنے ماہیے ہو چکے ہیں کہ وہ جب چاہیں اپنے ماہیوں کے مجموعے چھپوا سکتی ہیں۔ سو ان تینوں کی طرف سے اچھی خبر کی امید رکھی جا سکتی ہے۔

پنجابی ماہیے میں نسائی آواز فریاد اور گلے شکوے کی حد سے آگے نہیں جا پاتی۔ اردو میں بھی اسی انداز کے متعدد ماہیے ملتے ہیں۔

تکلے پر پونی ہو
ٹوٹے جب دھاگا
دکھ چادر دونی ہو
(منزہ اختر شاد)

رُت آ گئی یادوں کی
ایک ستم گر کی
اور ٹوٹتے وعدوں کی
(ثریا شہاب)

یہ رات اندھیری ہے
جان مری جب سے
رخ آپ نے پھیرا ہے
(بسمہ طاہر)

یہ رات اندھیری ہے
دل ہے یا فرحتؔ
زخموں کی ڈھیری ہے
(فرحت نواز)

انگور کا دانہ ہے
ہنسنا بھی بشریٰؔ
رونے کا بہانہ ہے
(بشریٰ رحمن)

شعلوں کو ہوا دی ہے
یاد تجھے کر کے
اس دل کو سزا دی ہے
(شاہدہ ناز)

تاہم اردو ماہیا نگار خواتین نے ماہیے کی پنجابی روایت کو نبھانے کے ساتھ سیاسی اور

سماجی شعور کا بے لاگ اظہار بھی کیا ہے۔ **بسمہ طاہر** نے کراچی کے حالات کے حوالے سے ایسے ماہیے کہے ہیں:۔

اک خوف کا ڈیرا ہے
نس نس میں سب کی
دہشت کا بسیرا ہے

گھنگور اندھیرا ہے
کوئی کرن یا رب!
بڑی دور سویرا ہے

اختر بانو ناز کے ہاں بابری مسجد کی شہادت کا المیہ کچھ یوں دکھ کا بیان بنتا ہے۔

ہم سب کو دُکھایا ہے
توڑ کے مسجد کو
دل مندر ڈھایا ہے

شاہدہ ناز کے ماہیوں میں سرکار کی لوٹ مار، ملک میں پھیلی بدامنی، فرقہ پرستی جیسے سامنے کے حالات سے لے کر جلتے ہوئے کشمیر تک سیاسی شعور کی ترقی پسند روایت کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اک تھال پکوڑوں کا
قرض وزیروں پر
ہے اربوں کروڑوں کا

اک جال بچھایا تھا
رہ کے حکومت میں
بس مال بنایا تھا

دھڑکا ہے پل پل کا
جس دن سے لاگو
قانون ہے جنگل کا

چنگاری بھڑکتی ہے
سب سے بڑا فتنہ
یہ فرقہ پرستی ہے

مسجد میں نمازی ہیں
خیر سے آئیں تو
سمجھو کہ وہ غازی ہیں

دھرتی ہے چناروں کی
ہولی نہیں کھیلو
اس میں انگاروں کی

رضیہ اسماعیل نے کشمیر کے سیاسی مسئلے کو ایک سماجی مسئلے کے تناظر میں یوں بیان کیا ہے:

کشمیر کی وادی ہے
جائے کوئی روکے
یہ جبری شادی ہے

یاسمین سحر کے ہاں مایوس کن حالات کے باوجود اندھیرے چھٹنے اور سورج طلوع ہونے کی امید روشن ہے۔

چھٹتے ہیں اندھیرے بھی
آس کے آنگن میں
ہوتے ہیں سویرے بھی

اسلحہ، بارود کے ڈھیر اور ایٹم بموں کے انبار کو **سلطانہ مہر** نے بیک وقت عالمی سطح پر بھی دکھایا ہے اور برصغیر کے علاقائی تناظر میں بھی۔

سو آنسو رلائیں گے
بارودی دانے
پھل ویسے ہی لائیں گے

جیون کی ضمانت بھی
کھیل ہے ایٹم کا
ویرانی کی دعوت بھی

ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر کی صاحبزادی **نگار سجاد ظہیر** نے ماہیا نگاری میں لوک روایت کو شہری زندگی میں مدغم کر کے اس انداز کے ماہیے کہے ہیں۔

سورج بھی ڈوب گیا
سردی دسمبر کی
مرا میت بھی چھوٹ گیا

آنکھوں میں ستارے تھے
تم نے کبھی سمجھا
جو من کے اشارے تھے

جیون ہے سفر لیکن
لوٹ کے مت جانا
تنہا ہوں تمہارے بن

بعض ماہیا نگار خواتین کے ہاں جنسی جذبہ اپنی پوری لطافت کے باوجود شوخ علامتوں میں بیان ہوا ہے۔ انداز بیان میں علامتوں کے استعمال سے جذبہ بے حد سبک اور لطیف ہو گیا ہے۔

گندم کا ہے اک دانہ
وصل کا موسم ہے
دل توڑ کے مت جانا
(کوثر بلوچ)

کتری ہوئی امبی ہے
آج اکیلی ہوں
اور رات بھی لمبی ہے
(منزہ اختر شاد)

ہر سیپ میں موتی ہے
دل کے سمندر میں
اک ناؤ بھی ہوتی ہے
(یاسمین سحر)

خواتین ماہیا نگاروں کے ہاں ترقی پسند سوچ کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ماہیوں کی

چند ملی جلی مثالیں بھی یہاں پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

طاقت پہ نہ جا اپنی
جو کچھ بونا ہے
پھل لائے وہی کرنی
(سلطانہ مہر)

پھر بدلیں نہ تقدیریں
پڑ گئیں ہاتھوں میں
حالات کی زنجیریں
(ثریا شہاب)

بڑھ آتا ہے سناٹا
شام کے ہوتے ہی
چھا جاتا ہے سناٹا
(نزہت سمن)

بستی ہے کسانوں کی
پھولی ہوئی سرسوں
اور فصل ہے دھانوں کی
(عذرا اصغر)

پہروں پہ پہرا ہے
دہشت گردی کا
دلدل یہ گہرا ہے
(ریحانہ سرور)

ہم جھوٹ نہیں کہتے
حق کے شیدائی
سولی سے نہیں ڈرتے
(اختر بانو ناز)

ایسے ماہیوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خواتین ماہیا نگاروں کے ہاں عصری حسیت کتنی توانا ہے۔ تاہم ماہیے کا وہ عمومی مزاج جو غنائیت سے لبریز ہے، خواتین ماہیا نگار اس سے بھی بے خبر یا بے تعلق نہیں ہیں۔ جہاں سیاسی و سماجی شعور رکھنے والے ماہیوں میں ماہیا نگار خواتین کی ترقی پسند سوچ اپنا اثر دکھاتی ہے وہیں محبت کے مضمون سے جڑے ہوئے ماہیوں میں پنجابی لوک رس کا جادو متاثر کرتا ہے۔ ایسے ماہیوں میں دکھ اور خوشی، دونوں حالتوں میں جذبوں کی معصومیت، ماہیے کی داخلی نغمگی کے ساتھ مل کر ماہیے کو دو آتشہ کر دیتی ہے۔ دوسری خواتین سے پہلے کچھ ذکر نسرین نقاش کا۔ **نسرین نقاش** کے ہاں جذبے منہ زور ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی بے باکی اور کھلا انداز ماہیے کی پنجابی روایت کی ایک خاص طرز کی عمدگی سے نمائندگی کرتے ہیں۔

جب تن سے ملے تن من
کھلنے لگیں کلیاں
مسکانے لگے گلشن

ملتا ہے جو ڈیرے میں
کیسے ٹوٹے مجھے
کم بخت اندھیرے میں

جو چاہے وہ شیر کرے
میری چلے نہ، مجھے
جب چاہے وہ زیر کرے

ویسے نسرین نقاش کے ہاں دوسرے مضامین بھی کثرت سے ملتے ہیں لیکن مذکورہ انداز کے ماہیوں کی چمک دمک اتنی ہوتی ہے کہ دوسری طرف زیادہ دھیان نہیں جا پاتا۔

اوراب دوسری ماہیا نگارخواتین کے ماہیے دیکھیں۔ یہاں محبت کا جذبہ کئی رنگوں میں جھلکتا ہے۔ لیکن بات ایسے ملفوف انداز میں بیان ہوتی ہے کہ کہیں بھی اظہار بے محابا نہیں ہوتا۔شرمیلی نگاہوں سے محبوب کوسوچنے کا انداز اس مجوبیت کی ترجمانی کرتا ہے جومشرقی عورت کا امتیاز رہا ہے۔ بات صرف محبت اورملن کی نہیں بلکہ اس میں دوسری کیفیات بھی موجود ہیں۔خوشی ہو یاغم خواتین کی محبت کامخصوص انداز ماہیوں میں انوکھی سی خوبصورتی پیدا کر دیتا ہے۔

پھولوں کی مہک پھیلی
دل کی سنی ہم نے
اوردل سے ہی سب کہہ لی

یادوں کی پناہوں سے
سوچتی بھی ہوں اسے
شرمیلی نگاہوں سے

تسبیح کے دانے ہیں
اپنے حصے کے
غم آپ اٹھانے ہیں

تم کونہ دغا دوں گی
بجھ گیادیپک تو
پوروں کوجلالوں گی
(شبہ طراز)

امرود کی ٹہنی ہے
اَن کہی بات کوئی
مجھےتم سے کہنی ہے
(کوثر بلوچ)

ندیا میں ہےطغیانی
ہار چکے بےشک
پر ہارنہیں مانی
(شاھدہ ناز)

برکھا کی بہاریں ہیں
تجھ بن اوسجنا
بےکیف پھواریں ہیں

آنگن میں کھلے بوٹے
کیسے موسم میں
وہ ہم سے رہے روٹھے

کیسےکوئی خواب آئے
یادکےسب منظر
پھر زیرآب آئے

کچنار کی کلیاں ہیں
آن ملوسجنا
سنسان سی گلیاں ہیں
(عذرا اصغر)

کیوں من مراجلتا ہے
اس میں کہیں جیسے
اک کانٹاسا چلتا ہے
(ثریا شھاب)

یادوں کوسجابیٹھے
اڑتے ہوئےپنچھی
کس ڈال پر جابیٹھے
(یاسمین سحر)

گنجل پڑے دھاگوں میں
لکھنے والے نے
کیالکھ دیا بھاگوں میں

تتلی کواڑاؤں میں
پیار کے رنگ کئی
کس کس کوچھپاؤں میں

مت دورکہیں جانا
رہ نہ سکوں تم بن
فرقت کانہ غم ڈھانا

لسی سے بھری چاٹی
عمرگذاری ہے
اک رات نہیں کاٹی
(منزہ اختر شاد)

پازیب چھنکتی تھی
اس کی ہنسی تھی یا
کوئی دھنک چمکتی تھی
(فرحت نواز)

لفظوں کوقلم کاٹے
روگ محبت کا
دیمک کی طرح چاٹے
(پرزرق صنم)

رت بدلی ہے جاڑوں کی
برف نہیں پگھلی
پراونچے پہاڑوں کی

تھاساتھ ہی جب جینا
کس لئے زہرغم
پھرتنہاپڑاپینا

جگ حیراں ہوگیا ہے
اک ترے جانے سے
دل ویراں ہوگیا ہے
(نزھت سمن)

پتھروں میں بھی جھرنے ہیں
برتن اپنے ہمیں
اب ان ہی سے بھرنے ہیں
(غزالہ طلعت)

سانسوں میں گھٹن جیسیا
کون چھپا ہے یہ
سینے میں چبھن جیسیا
(سلطانہ مھر)

یہ دن کب دیکھا تھا
ہم یوں جداہوں گے
کب پہلے یہ سوچا تھا
(یاسمین مبارک)

اک چندساچمکے ہے
پیار ترا پگلی
آنکھوں سے چھلکے ہے
(نازیہ رحمٰن)

نہیں بات یہ بھولوں کی
ان سے بچھڑنے میں
تھی بات اصولوں کی
(اختر بانو ناز)

غم دل کانہاں رکھنا
لب پہ سدا اپنے
مسرور بیان رکھنا
(صدف جعفری)

سیما شکیب نے پہلے مختلف انداز میں ماہیے کہے تھے،تاہم ان کے پنجابی لَے والے جو ماہیے فی الوقت دستیاب ہو سکے ہیں،ان کی لوک اور ادبی اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ثروت محی الدین کے ماہیوں میں پنجاب رنگ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔جبکہ ترنم ریاض اور بشریٰ رحمٰن کے ماہیے اردو ماہیے میں خواتین کے اس لب و لہجے کا احساس دلاتے ہیں جو اردو میں خواتین ماہیا نگاروں کے لئے ایک معیار کے طور پر سامنے آ سکتا ہے۔

کتنی بے حال ہوئی
کوئی سنبھالو مجھے
میں غم سے نڈھال ہوئی

آنکھوں میں پیاس لگے
شام پہاڑوں کی
کس قدر اداس لگے

ریشم کی پراندی ہے
درد جدائی کا
طوفان ہے آندھی ہے

000

دو اور دو چار ہوئے
سترہ مہینے ہوئے
ماہی سنگ پیار ہوئے
(ترنم ریاض)

مجھے اپنا کر ڈالا
پھولوں سے ماہی نے
مرا دامن بھر ڈالا
(ترنم ریاض)

اب سج گئے اردو سے
ماہیے مہکتے تھے
پنجابی کی خوشبو سے
(ترنم ریاض)

000

مرے پاؤں میں پائل ہے
دل نہ دکھا ماہیا
دل پہلے ہی گھائل ہے

کھڑکی میں چندا ہے
عشق نہیں آساں
یہ روح کا پھندا ہے

اسمانی تارے ہیں
دل کو جلائیں جو
ہمراز ہمارے ہیں

000

تو مرا کھویا ہے
میں اس پار کھڑی
اور بیچ میں نیا ہے
(بشریٰ رحمٰن)

دل درد کا ساگر ہے
ہتھ نہ بڑھا سجنا
مرے سر پہ گاگر ہے
(بشریٰ رحمٰن)

کرسی کی کہانی ہے
جیل کے اندر بھی
کیا شام سہانی ہے
(بشریٰ رحمٰن)

000

دو پھول گلابوں کے
آنکھوں میں پھیلے
یہ رنگ ہیں خوابوں کے

بہتا ہوا پانی ہے
میلہ دو دن کا
یہ حسن جوانی ہے

000

کمہار کا آوا ہے
تیرے بچھڑنے کا
اب تک پچھتاوا ہے
(ثروت محی الدین)

رنگ لال اناروں کا
تم پردیس گئے
کیا لطف نظاروں کا
(ثروت محی الدین)

000

سینے میں چبھا کانٹا
درد جدائی کا
سکھیوں نے نہیں بانٹا

دن رات کا جلنا ہے
ترے بنا جینا
تلوار پہ چلنا ہے

000

کچھ منہ سے نہ کہتے تھے
ہم ترے پہلو میں
دکھ ہجر کا سہتے تھے
(سیما شکیب)

مہندی کا رچاؤ ہے
کس کو خبر دل میں
کتنا بڑا گھاؤ ہے
(سیما شکیب)

آخر میں پردیس کے حوالے سے **بشریٰ رحمٰن** کا یہ ماہیا:

پردیس نہ جا ماہیا
پھر پچھتائے گا
مجھے دل سے لگا ماہیا

پردیس میں جا بسنے والوں پر پھر کیا گزرتی ہے؟ اس کا جو خوبصورت اظہار **رضیہ اسماعیل** کے ماہیوں میں ملتا ہے، اس موضوع کے حوالے سے مجھے ابھی تک اس سے اچھے ماہیے نہیں مل سکے۔

کڑوے ہیں سُکھ ماہیا
کس کو سنائیں اب
انگلینڈ کے دُکھ ماہیا

کلچر کا رونا ہے
آ کے ولایت میں
اب کچھ تو کھونا ہے

دادا ہے، نہ دادی ہے
پکڑ کے ڈیڈی نے
شادی کروا دی ہے

میں نے **گلبن** احمد آباد، **بھنگڑا** گوجرانوالہ، **قرطاس** ناگپور اور **نیرنگ خیال** راولپنڈی کے ماہیا نمبروں کو سامنے رکھا ہے۔ سہ ماہی **علم و فن** گوجرانوالہ کا **خواتین ماهیا نگار نمبر** اور عارف فرہاد کی تحقیقی و تنقیدی کتاب **اردو ماهیے کے خدو خال** بھی میرے سامنے ہیں۔صرف ان رسائل اور کتاب میں شامل ماہیا نگار خواتین کی تعداد ایک سو کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ان میں بعض نے ایک دو بار ہی ماہیا نگاری کی ہے، تاہم بیشتر شاعرات نے ماہیا کو اپنے جذبات کے اظہار کا ایک فطری ذریعہ محسوس کر کے ماہیے کہے ہیں۔اوپر جن خواتین کا کسی نہ کسی حوالے سے ذکر ہو چکا ہے، ان سے قطع نظر یہاں میں ایسی چند شاعرات کے نام ضرور درج کروں گا جنہوں نے تھوڑے ماہیے کہے لیکن جتنے کہے اس سے ماہیے میں خوبصورت اضافہ ہی کیا۔ پربھا ماتھر، صابرہ خاتون حنا، کامنی دیوی، انیتا مروندی، رقیہ منیر، زبیدہ صبا، عفراء قریشی، نزہت سمن، انیلا سحر، شگفتہ یاسمین غزل، مصباح مرزا، یاسمین مبارک، رخسانہ نور، شاہدہ لطیف، عظمیٰ ناز، فرحت نسیم ہاشمی، کوثر صدیقی اور نینا جوگن۔

اردو ماہیا نگاری کے فروغ میں خواتین کے حصہ کو دیکھتے ہوئے مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ خواتین ماہیا نگاروں نے اردو ماہیے کہتے وقت ایک طرف خود کو ماہیے کی لوک روایت سے منسلک رکھا ہے تو دوسری طرف اپنے عہد کے مسائل اور دکھوں کا بھی سامنا کیا ہے۔ یوں ماہیا نگار خواتین کے ہاں عمومی طور پر اردو ماہیا اپنی اصل روایت سے منقطع ہوئے بغیر ارتقائی سفر کر رہا ہے۔ اردو ماہیے کے اس ابتدائی دور میں ماہیا نگار خواتین کی یہ گراں قدر تخلیقی خدمات فراموش نہیں کی جا

سکیں گی۔ مجھے امید ہے کہ ان شمعوں سے مزید شمعیں روشن ہوں گی اور نئی شعری اصناف میں سے اردو ماہیا اکیسویں صدی کی مقبول ترین شعری صنف ثابت ہوگا۔

(سانجھاں لاہور، نوائے وقت کراچی میں یہ مضمون شائع ہوا تھا۔معیّن حوالے دستیاب نہیں ہیں۔علم و فن گوجرانوالہ کے خواتین ماہیا نگار نمبر میں بھی اسے شائع کیا گیا۔۔تاہم اس مضمون میں مجھے تدریجاً اضافے کرتے رہنا پڑے ہیں اور اس وقت تک اسے اپ ڈیٹ کر لیا ہے۔)

اردو ماہیے کے دس سال

(مخالفین کی مخالفت کے آئینے میں)

1990ء میں ماہیے کے وزن کا مسئلہ اٹھایا گیا۔تب ایک طرف ماہیے کے خدوخال کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے اخلاص کے ساتھ کام شروع ہوا اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں پر ماہیے کی لوک لَے بتدریج واضح ہوتی گئی۔دوسری طرف ماہیے کی تحریک کی زبردست کامیابی اور مقبولیت سے برہم ہونے والوں نے اعتراض برائے اعتراض کے طور پر مسلسل پینترے بدلے۔ایک اعتراض کا مدلل جواب مل جانے کے بعد اعتراض کا دوسرا محاذ کھول دیا گیا۔علمی بحث میں کج بحثی کرنے کے ساتھ بہتان طرازی کا عمل روا رکھا گیا اور یہ کھیل ابھی تک جاری ہے۔اردو ماہیے کی حالیہ تحریک کے دس سال اس برس پورے ہو رہے ہیں۔ان دس برسوں میں معترضین کے کیمپ نے جس طرح بار بار اپنے موقف کو تبدیل کیا اور ہر حال میں اعتراضات کی گرد اڑانے کی کوشش کرتے رہے، یہاں اس کا ایک خاکہ پیش کر دینا مناسب رہے گا۔

ا۔جب ماہیے کے دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کی کمی پر اصرار کیا گیا تو تحدّی کے ساتھ دعویٰ کیا گیا کہ پنجابی میں ماہیا صرف تین مساوی الوزن مصرعوں میں ہی ہوتا ہے۔

۲۔جب یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ پنجابی ماہیے کی لوک لَے کی بنیاد پر دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کی کمی لازم ہے۔تب یہ کہا جانے لگا کہ ماہیے کے لئے دونوں اوزان روا رکھے جائیں۔

۳۔جب یہ بات نہیں چلی تو انتہائی غصے کے ساتھ کہا گیا کہ ماہیا اَن پڑھ دیہاتیوں کی گھڑت ہے۔ان میں کسی وزن کی تلاش بے سود ہے۔

۴۔جب اس غلط فہمی کو دور کر دیا گیا تو پھر کہا گیا کہ پنجابی ماہیا تو بے شک ایسا ہی ہے لیکن اردو میں

تین مساوی الوزن مصرعوں کا ماہیا بھی مان لینا چاہئے۔کوئی حرج نہیں ہوگا۔

۵۔جب ماہیے کی دُھن کی بنیاد پر متبادل عروضی اوزان کی تلاش شروع ہوئی اور ہماری طرف سے تسکینِ اوسط کے حوالے سے بات کی گئی تو طنز کیا گیا کہ یہاں عروض کی ریڑھ ماری گئی ہے لیکن جب علم عروض میں مہارت رکھنے والے ہمارے احباب نے اسے غلط ثابت کر دیا تو نئے شوشے چھوڑے جانے لگے۔

۶۔جب علمی سطح پر مخالفین کی ساری دلیلیں غیر موثر ہو گئیں تو چڑ کر ماہیے کی بحث کو کافروں کی سازش قرار دے دیا گیا۔

کوئی جب نہ جواب آیا
میرے خلاف کئی
فتوے وہ لکھا لایا
(ناصر نظامی)

۷۔جب یہ حربہ بھی کامیاب نہ ہوا تو ماہیے کی تحریک سے متعلق شخصیات کے خلاف غلیظ زبان استعمال کرتے ہوئے ذاتی حملے کئے گئے۔بہتان طرازی کی باقاعدہ مہم چلائی گئی۔

۸۔جب ایک طرف سے بہتان طرازی کی مہم کا دباؤ بڑھایا گیا تو دوسری طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ماہئے کو سہ مصرعی فارم کی بجائے ڈیڑھ مصرعی فارم میں کر لیا جائے۔

۹۔جب ڈیڑھ مصرعی فارم کی تجویز کو ''چور دروازہ'' بنا کر ثلاثی نگاروں کو ماہیا نگار منوانے کی چال بتایا گیا تب مخالفین نے حکماً کہنا شروع کر دیا کہ ماہیا ہوتا ہی ڈیڑھ مصرعی فارم میں ہے۔

۱۰۔جب پنجابی ماہیے میں سہ مصرعی تحریری ہیئت کی مضبوط روایت کو واضح کیا گیا ''پنجابی ادبی بورڈ۔لاہور'' اور ''لوک ورثہ کا قومی ادارہ۔اسلام آباد'' کی شائع کردہ سہ مصرعی فارم کے پنجابی ماہیوں کے ضخیم انتخاب کی کتابوں کے حوالے دیئے گئے تو اس کا کوئی مدلل جواب ہی نہیں دیا گیا۔سہ مصرعی ''ثلاثی''، قسم کی چیزیں ''ماہیے'' کے لیبل کے ساتھ پیش کرنے والوں کو کسی نے میلی نظر سے بھی نہیں دیکھا۔سارا غم و غصہ ماہیے کی لوک لَے کو محفوظ رکھنے والوں کے خلاف ہی اتارا جاتا رہا۔

۱۱۔ جب ہمت رائے شرما جی کے ایک دو خطوط میں ان کی ماہیا نگاری کا سال سہواً ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء لکھا گیا تو چراغ حسن حسرت کے ۱۹۳۷ء کے ثلاثی طرز کے گیت کو ماہیے کا اولین اردو نقش قرار دے کر شور مچا دیا گیا لیکن جب اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما جی کے اولین ماہیے کہنے کا سال (مئی) ۱۹۳۶ء ثابت ہو گیا تو شور مچانے والوں کو شرمندہ ہونے کی توفیق نہیں ملی۔

۱۲۔ جب حسرتؔ کا سہارا لیا گیا تو یہ اصول وضع کیا گیا۔ ''جہاں تک اردو ماہیے کا تعلق ہے اسے اگر پنجابی سے لی ہوئی صنف کے بجائے خالص اردو ہی کی نووارد صنف تسلیم کر لیا جائے تو تب بھی، یہ اردو میں بھی ڈیڑھ مصرعے والی صنف ہے''۔ مخالفین کے اس اصول کی رو سے خالص اردو کی صنف کے طور پر بھی ہمت رائے شرما جی نے سب سے پہلے ماہیے کہے تھے۔ فلم ''خاموشی'' کے یہ ماہیے ان کے شعری مجموعہ ''شہاب ثاقب'' میں سہ مصرعی ہیئت میں ادبی رنگ اور ادبی شان کے ساتھ شامل ہیں۔ اردو ماہیے کی تحریک کی دس سالہ مخالفت کا یہ مختصر سا خاکہ ہے۔ تمام نام اور مکمل حوالہ جات میری کتاب ''ماہیا۔ علمی بحث سے غوغائے رقیباں تک'' (۱) میں شائع ہوں گے۔ بے شک ماہیے کے مخالفین کی بے تکی اور حاسدانہ مخالفت اور ان کے تضادات نے اردو ماہیے کی تحریک کے لئے ''دیسی کھاد'' کا کام کیا ہے۔

(مطبوعہ سہ ماہی اسباق پونہ، انڈیا۔ اکتوبر تا دسمبر 1999ء
عکاس وہاڑی، پاکستان۔ جنوری 2000ء)

(۱) ''ماہیا۔ علمی بحث سے غوغائے رقیباں تک'' کا میٹر میرے پاس محفوظ ہے لیکن اب اس کتاب کو شائع نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ **(ح۔ق)**

اوراق اور ماہیا

اس مضمون کے لئے وزیر آغا صاحب نے مجھے 21 نومبر 1999ء کے خط میں فرمائش کی ہے اور 10 دسمبر تک مضمون طلب بھی فرمایا ہے جبکہ یہاں میرے پاس ''اوراق'' کی مکمل فائل موجود نہیں۔ 1992ء سے پہلے کے چند حوالہ جات اور چند اہم تحریروں کی فوٹو کاپیاں میرے پاس موجود ہیں۔ یوں بیشتر اہم روداد تو اس مضمون میں آ جائے گی تاہم ممکن ہے مزید حوالہ جات دستیاب ہونے کی صورت میں یہ مضمون زیادہ بہتر ہو جاتا۔ **(حیدر قریشی)**

''اوراق'' میں ماہیا نما ثلاثی 1986ء سے ذرا پہلے چھپنا شروع ہوئے تھے۔ نصیر احمد ناصر اور علی محمد فرشی نے اس سلسلے میں اچھا تخلیقی کام کیا۔ ''اوراق'' کے شمارہ اپریل۔ مئی 1987ء میں قیوم طاہر کے اسی انداز کے ''ماہیے'' شائع ہوئے۔ پھر سیدہ حنا اس میدان میں آئیں۔ یہ ''ماہیے'' اپنے مقامی رنگ کے باعث پرکشش تھے۔ خصوصاً مساوی الوزن سہ مصرعی ہائیکو کے مقابلہ میں ان کا رس اور کسی قدر لوک رنگ سے ملتا جلتا انداز زیادہ متاثر کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ماہیے کے وزن کی طرف سب سے پہلے ''اوراق'' میں ممتاز عارف نے توجہ دلائی تھی لیکن شمارہ اگست 1990ء سے پہلے، ممتاز عارف کی نشاندہی سے پہلے، ''اوراق'' کے کسی شمارہ میں حسن عباس رضا کے چند درد بھرے ''ماہیے'' شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے دو ماہیے تو مکمل طور پر ماہیے کی لوک لے کی پابندی کر رہے ہیں۔

دل اپنے کشادہ تھے
اس لئے رونا پڑا
ہم ہنستے زیادہ تھے

ہم سہمے پرندے ہیں
سبز رتوں میں بھی
پرواز سے ڈرتے ہیں

سو کہا جا سکتا ہے کہ ماہیے کے درست وزن کی نشاندہی سے پہلے ادبی رسائل کی سطح پر درست وزن کے اولین دو نمونے یہی ماہیے تھے اور یہ ماہیے ''اوراق'' ہی میں شائع ہوئے تھے۔ ''اوراق'' کے شمارہ اگست 1990ء میں ممتاز عارف کا وہ تاریخی خط شائع ہوا تھا جس کے بارے میں انہیں خود بھی اندازہ نہ ہوگا کہ یہ ایک تحریک کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ تاہم ممتاز عارف کے خط میں بعض سقم بھی موجود تھے جن میں سب سے بڑا سقم یہ تھا کہ انہوں نے حسرت کے ''ماہیا نما'' کو تھوڑے سے تصرف کے ساتھ ماہیا کر دیا تھا جبکہ مثالی نمونہ پیش کرنے کے لئے فلم ''پھاگن'' اور فلم ''نیا دور'' کے ماہیے زیادہ مناسب تھے۔ ممتاز عارف نے ماہیے کی لے کی بنیاد پر اس کے وزن کو دریافت کرنے کی کاوش تو نہیں کی لیکن ماہیے کے ''مخصوص وزن'' کا اشارہ کر کے انہوں نے ماہیے کی لے کی طرف توجہ کرنے کی راہ ضرور ہموار کر دی۔ پھر انہوں نے مدیر ''اوراق'' سے بجا طور پر یہ گذارش کی کہ ''ماہیوں کی اشاعت کے وقت ماہیے کے مخصوص وزن کو پیش نظر ضرور رکھیں۔''

''اوراق'' کے شمارہ دسمبر 1990ء میں میرے خط میں ممتاز عارف کے موقف کی بھرپور تائید کی گئی اور ساتھ ہی جملہ ''ماہیا نگاروں'' کو یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ وہ مل کر طے کر لیں کہ اردو ماہیے کو اصل پنجابی ماہیے کی طرح رکھنا ہے یا اس کا حشر بھی ہائیکو جیسا کرانا ہے۔ اس کے بعد ماہیے کی لوک لے کے حوالے سے ''اوراق'' کے خطوط کے صفحات پر تذکرہ تو ہوتا رہا لیکن ابھی اس مسئلے پر کوئی مضمون یا درست وزن کے ماہیے ''اوراق'' میں شائع نہیں ہوئے تھے جبکہ ''ادب لطیف'' لاہور شمارہ نومبر 1990ء میں میرے ماہیے شائع ہوئے اور روزنامہ ''نوائے وقت'' راولپنڈی شمارہ 24 مئی 1992ء میں افتخار احمد کا مضمون ''اردو ماہیے'' شائع ہوا۔ یہی مضمون بعد میں ''صریر'' کراچی اور ''تجدید نو'' اسلام آباد میں بھی شائع ہوا۔ اور میرے ماہیے ''ادب لطیف'' کے معاً بعد ''صریر''، ''ابلاغ'' اور بعض دیگر رسائل میں شائع ہوئے۔ اس عرصہ میں ''اوراق'' میں تین ہم وزن

مصرعوں کے ماہیے شائع ہوتے رہے۔ ''اوراق'' کے شمارہ نومبر، دسمبر 1992ء میں سعید شباب نے ''اوراق'' میں پنجابی ماہیے کے وزن والے ماہیے چھاپنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا:

''امید ہے دیگر ادبی جرائد کی طرح ''اوراق'' بھی اب اصل وزن کے ماہیے چھاپنا شروع کردے گا۔''

سعید شباب کے اسی خط کے ساتھ ''اوراق'' کے شمارہ نومبر، دسمبر 1992ء میں ایم اے تنویر کے ''ماہیوں'' کے ساتھ حیدر قریشی اور نوید رضا کے درست وزن کے ماہیے شائع ہوئے۔ اس سے اگلے شمارہ میں ایم اے تنویر اور سیدہ حنا کے مساوی الوزن سہ مصرعی ''ماہیوں'' کے ساتھ پھر حیدر قریشی کے ماہیے شائع ہوئے لیکن شمارہ مئی، جون 1993ء کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ اس میں ناصر عباس نیرؔ کا ایک اہم مضمون ''ماہیا اور اردو میں ماہیا نگاری'' شائع ہوا۔ ماہیے کی تہذیبی و ثقافتی پہچان کے حوالے سے یہ ایسا بنیادی نوعیت کا اہم مضمون تھا جس سے آج بھی نہ صرف استفادہ کیا جا سکتا ہے بلکہ کئی حوالوں سے یہ نئے ماہیا نگاروں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔

مضمون کے دوسرے حصہ میں ناصر عباس نیرؔ نے دونوں طرح کے ماہیوں کو جائز قرار دیا۔ اس کے جواب میں، میں نے ''ماہیے کے وزن کا مسئلہ'' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اسے ''اوراق'' میں خطوط کے صفحات پر شائع کیا گیا تاہم پورا مضمون شائع کر دیا گیا۔ ناصر عباس نیرؔ کے مضمون نے ماہیے کے وزن کی بحث کو متحرک کر دیا تھا۔ شمارہ نومبر، دسمبر 1993ء میں ایم اے تنویر کے ''ماہیوں'' کے ساتھ حیدر قریشی، رشید اعجاز، نذیر فتح پوری اور غزالہ طلعت کے ماہیے شائع ہوئے۔ 1994ء سے 1999ء تک چھ سال کے عرصہ میں ''اوراق'' میں ان لوگوں کے ماہیے شائع ہوئے۔

شمارہ	**درست وزن والے ماہیا نگار**	مساوی الوزن مصرعوں والے ماہیا نگار
جولائی۔اگست 1994	نذیر فتح پوری، رشید اعجاز	سیما پیروز، نثار ترابی
فروری۔مارچ 1995ء	فرحت نواز، سعید شباب، رشید اعجاز، شجاعت علی راہی	سیما پیروز، نثار ترابی، ایم اے تنویر

اگست۔ستمبر1995ء — ضمیر اظہر، نذیر فتح پوری، نثارترابی،علی محمد فرشی
شجاعت علی راہی، یوسف اختر

جنوری۔فروری1996ء — پروین کمار اشک، حیدرقریشی، ا*ایم اے تنویر
نذیر فتح پوری، فرحت نواز،
شجاعت علی راہی، مناظر عاشق
ہرگانوی

جولائی۔اگست1996ء — حیدر قریشی، احمد حسین مجاہد، نسیم سحر،علی محمد فرشی
سعید شباب، قاضی اعجاز محور،
اجمل پاشا، ندیم شعیب، نذیر
فتح پوری

جنوری۔فروری1997ء — حیدر قریشی، سعید شباب، سیما پیروز، سجاد مرزا*۲
پروین کمار اشک، اجمل پاشا

جولائی۔اگست1997ء — شاہدہ ناز، حیدرقریشی،
نذیر فتح پوری، یوسف اختر

جنوری۔فروری1998ء — سلطانہ مہر، ثریا شہاب، مناظر عاشق*۳
شاہد جمیل، انور مینائی*۴

جولائی۔اگست1998ء — حیدر قریشی، ثریا شہاب،
عارف فرہاد، ذوالفقار احسن،
یوسف اختر، رستم نامی

جنوری۔فروری 1999ء — پرویز بزمی، حیدر قریشی، علی محمد فرشی
یوسف اختر، مناظر عاشق،
سلطانہ مہر، مسعود ہاشمی

جولائی۔اگست1999ء — حیدرقریشی، سلطانہ مہر، ثرون
کمار ورما، ترنم ریاض

جب سے ''اوراق'' میں پنجابی ماہیے کی لے سے مطابقت رکھنے والے ماہیے چھپنا شروع ہوئے ہیں تب سے اب تک غلط وزن میں ''ماہیے'' کہنے والے چھ ماہیا نگاروں کے ''ماہیے'' مجموعی طور پر 16 بار شائع ہوئے اور درست وزن میں ماہیے کہنے والے 28 ماہیا نگاروں کے ماہیے 58 بار شائع ہوئے۔اس صورتحال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لوک لے کی بنیاد پر کہا جانے والا ماہیا مسلسل مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ماہیے کی اس مقبولیت میں ان مباحث کا بہت عمل دخل ہے جو ''اوراق'' کے صفحات پر ہوتی رہی ہیں۔

ناصرعباس نیرّ کے مذکورہ بالا مضمون کے بعد ڈاکٹر صابر آفاقی، احمد صغیر صدیقی، نسیم سحر اور ضیا شبنمی نے اپنے خطوط میں اختلافی زاویے کو نمایاں کیا تاہم ان میں سے ڈاکٹر صابر آفاقی بہت جلد ماہیے کے درست وزن کو مان گئے اور احمد صغیر صدیقی سلیقے سے اس بحث سے ہی الگ ہو گئے۔ویسے احمد صغیر صدیقی نے اپنے اعتراض کے باوجود یہ لکھا کہ

''دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کی کمی کو طبلے کی تھاپ سے پورا کیا جاتا ہے''

جبکہ نسیم سحر نے جو ماہیے کو زیادہ بہتر جانتے ہیں، یہ حیران کن بات لوک لے والے ماہیے کے بارے میں لکھی کہ

''ماہیے کو ترنم سے الاپتے ہوئے جب دوسرے مصرعہ پر پہنچیں تو جھٹکا سا لگتا ہے۔''

حالانکہ یہ صورت حال مساوی الوزن سہ مصرعی ماہیوں میں پیش آتی ہے۔

ضیاء شبنمی نے تادمِ تحریر کوئی ماہیا نہیں لکھا لیکن ماہیے کے بارے میں سب سے مزیدار بات انہوں نے لکھی۔ان کے الفاظ میں ''یار لوگوں نے ماہیے کے بھی درمیانی مصرعے پر وار کیا ہوا ہے۔میرے خیال میں پنجابی ماہیا اس قید سے آزاد ہے۔اگر آزاد نہیں ہے تو اردو ماہیے کو اس سے آزاد ہونا چاہیے۔

''خطوط کے صفحات پر دیگر ادیبوں میں عارف فرہاد، ہیرانند سوز، شاہد جمیل، نصیر احمد ناصر،

ذکاء الدین شایاں، ناصر شہزاد اور صادق عدیل فرشتہ نے اپنے خطوط میں اختلافی رائے کا یا دوسرے موقف کی تائید کا انداز اختیار کیا لیکن اول الذکر تینوں اہم ادیب اب لوک لے کے مطابق عمدہ ماہیے کہہ رہے ہیں۔

ہمارے موقف کی حمایت میں کھل کر لکھنے والوں میں سعید شباب، نیاز احمد صوفی، ارشد خالد، راز سنتو کھ سری، ملاپ چند، عبدالقیوم، احمد حسین مجاہد، غلام شبیر رانا، طاہر مجید، اجمل پاشا اور ڈاکٹر عنوان چشتی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔بعض خطوط میں اگرچہ رواروی میں ماہیے کا ذکر کیا گیا لیکن ان سے بھی ماہیے کی طرف قارئین کی تھوڑی بہت توجہ مبذول ہوئی۔ایسے مکتوب نگاروں میں رام لعل، جوگندر پال، افضل گورایہ، عابد انصاری، فیروز شاہ، سرمد جمالی، عباس رضوی، تنویر قاضی، فوزی خان، سحر سیال، مشتاق احمد، سجاد مرزا، ایم ڈی شاد، سرفراز تبسم، اکبر حمیدی وغیرہ شامل ہیں تاہم ماہیے کے فروغ میں نثار ترابی کے ایک طویل خط کو خاص اہمیت حاصل ہے۔''اوراق'' کے شمارہ اگست، ستمبر 1995ء میں شائع ہونے والے نثار ترابی کے خط میں ان کا موقف کھل کر سامنے آیا تو شمارہ جنوری، فروری 1996ء میں میرا جوابی خط شائع ہوا۔یہ دونوں خطوط ماہیے کی تفہیم میں خاصے مفید ثابت ہوئے۔

''اوراق'' کے شمارہ جنوری، فروری 1997ء میں ''ماہیا اور ماہیا نگاری'' کے زیر عنوان ایک الگ سیکشن بنایا گیا۔اس میں میرے مضمون ''ماہیے کا فروغ'' کے ساتھ چار درست وزن والے ماہیا نگاروں کو شامل کیا گیا۔جولائی، اگست 1997ء کے شمارہ میں میرے ماہیوں کے مجموعہ ''محبت کے پھول'' پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے مرتب کردہ ماہیوں کے انتخاب ''رم جھم رم جھم'' پر اجمل پاشا کا تبصرہ شائع ہوا۔

1998ء میں ''اوراق'' کے دونوں شماروں میں گہما گہمی اور گرما گرمی رہی۔ایک طرف امین خیال کے ماہیوں کے مجموعہ ''یادوں کے سفینے'' پر ذوالفقار احسن کا تبصرہ اور نذیر فتح پوری کے ماہیوں کے مجموعہ ''ریگِ رواں'' پر اسلم حنیف کا مضمون شائع ہوا تو دوسری طرف ظہیر غازی پوری نے ''اردو ماہیا فن، تکنیک اور موضوع'' کے زیر عنوان ایک مضمون ماہیے کی خیر خواہی کے جذبے

کے ساتھ پیش کیا۔اس مضمون کی بعض بنیادی اغلاط کی میں نے بھی اپنے تفصیلی خط میں نشاندہی کی لیکن ''جیسا مضمون ویسا جواب'' کے مصداق اس کا اصل جواب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے مضمون ''اردو ماہیا۔بحث در بحث'' میں پیش کیا۔بعد میں ظہیر غازی پوری نے بعض وضاحتیں کرنا چاہیں لیکن وہ عذر گناہ بدتر از گناہ ثابت ہوئیں۔ماہیے کی خیر خواہی کے جذبے سے مضمون لکھنے والے ظہیر صاحب آخر میں اس بات پر خوش دکھائی دینے لگے کہ انہیں کسی دوست نے خط لکھ دیا ہے کہ ماہیے کا انجام بھی آزاد غزل جیسا ہوگا اس لئے اس بحث میں نہیں الجھیں۔

اسی برس میں میرا مضمون ''ماہیا کیوں؟'' ''اوراق'' کے جنوری کے شمارہ میں شائع ہوا۔یہ مضمون ماہیے کے تعلق سے ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کے تین اہم سوالوں کے جواب پر مبنی تھا۔اس مضمون کے نتیجہ میں مجھے ماہیے کے ادبی اور ثقافتی کردار پر غور و فکر کرنے کا موقع ملا۔

بیسویں صدی کے آخری برس کے پہلے شمارہ میں میرا تحقیقی نوعیت کا مضمون ''اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما'' ''اوراق'' نے شائع کیا لیکن اس شمارہ کا ہنگامہ خیز مضمون پرویز بزمی نے تحریر کیا تھا۔''پنجابی ماہیا کی ہیئت اور وزن'' کے زیر عنوان چھپنے والے مضمون میں پرویز بزمی نے دعویٰ کیا کہ ماہیا سہ مصرعی نہیں بلکہ ڈیڑھ مصرعی صنف ہے۔اس مضمون کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے میں نے پرویز بزمی کے بنیادی اعتراض کا مدلل جواب دیا جو ''اوراق'' کے شمارہ جولائی، اگست 1999ء میں شائع ہوا۔

اسی شمارہ میں علی محمد فرشی کے ماہیا نما ثلاثی کے مجموعہ ''دکھ لال پرندہ ہے'' پر ستیہ پال آنند کا مضمون شائع ہوا۔اردو ماہیے کی تحریک کے نتیجہ میں اب اگر مہاراشٹر، بہار یا راجستھان کے کسی ادیب سے بھی پوچھا جائے تو وہ پنجابی ماہیے کے بارے میں اتنی بات تو آسانی سے بتا دے گا کہ پنجابی ماہیے میں عمومی طور پر عورت کی آواز سنائی دیتی ہے۔

اسی بنیاد پر میں نے اپنی کتاب ''اردو میں ماہیا نگاری'' میں اس کے سرے ہندی گیت کی قدیم روایت سے بھی جوڑے تھے لیکن ستیہ پال آنند نے اپنے مضمون میں اسے ہندی گیت کی ''روایت کے برعکس'' لکھتے ہوئے ''مرد کی طرز سخن'' قرار دیا ہے جو علمی لحاظ سے حیران کن بات

ہے۔ستیہ پال آنند نے ''دکھ لال پرندہ ہے'' کے ایسے اوزان کے ماہیوں کی بابت بھی خاموشی اختیار کی ہے۔

تیری سیج گلابی
اپنے باغوں سے کچھ
سپنے بھیج گلابی

دور چمکتے تارے
کروٹ کروٹ روئیں
ہم خوابوں کے مارے

اک بے نام سا رشتہ
میں پاگل سودائی
وہ انجان فرشتہ

ماہیے کی ڈیڑھ مصرعی ہیئت کے حوالے سے مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب علی محمد فرشی ،نصیر احمد ناصر اور سیدہ حنا اپنے ہم وزن ''ماہیے'' سہ مصرعی فارم میں لکھ رہے تھے تب انجم نیازی نے کسی بحث کے بغیر ''اوراق'' میں اپنے ویسے ہی ''ماہیے'' ڈیڑھ مصرعی فارم میں شائع کرائے تھے لیکن تب بھی کسی نے اس فارم میں دلچسپی نہیں لی تھی۔

ماہیے کے مزاج کے سلسلے میں بعض لوگوں نے اہم سوال اٹھائے ہیں اور خصوصاً غزل کے مضامین سے اسے بچانے کی تاکید کی ہے۔پھر ماہیے کے معیار کا مسئلہ بھی اٹھایا گیا ہے۔اس سلسلے میں ''اوراق'' میں چھپنے والے ماہیوں کا ایک بڑا حصہ معیاری تخلیقات پر مشتمل ہے۔

جہاں تک غزل کے مضامین سے بچنے کی تاکید کا تعلق ہے،مشورہ اچھا بھی ہے اور ماہیے کے لئے مفید بھی ثابت ہوگا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اردو غزل اتنی طاقتور صنف ہے کہ آزاد نظم بھی اس کے اثرات سے بچ نہیں سکی۔ماہیا تو ویسے بھی بعض مضامین کے اظہار میں غزل سے خاصا قریب ہے اور تو اور جدید نظم کے شاعر نصیر احمد ناصر بھی جب اپنے انداز میں ''ماہیا'' کہتے ہوئے یہ کہتے ہیں۔

دیوار نہ در ہوتا
ناصر کسی بستی میں
ایسا کوئی گھر ہوتا

(مطبوعہ ''اوراق'' اپریل۔مئی 1987ء)

تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ غالب کی ''بے در و دیوار کا گھر'' بنانے کی خواہش غیر ارادی طور پر ان کے ہاں آ گئی ہے۔

سو غزل کے مضامین سے بچنے اور ماہیے کے مزاج کو برقرار رکھنے کی تلقین جاری رہنی چاہئے تاہم غیر پنجابی علاقوں میں نئے تجربات کے باعث اگر کہیں اجنبیت کا ہلکا سا احساس ہوتا ہے تو اس سے بھی مانوسیت پیدا کرنی چاہئے کہ یہ مرحلہ ابھی ماہیے کا بالکل ابتدائی مرحلہ ہے۔یہاں ''اوراق'' میں چھپنے والے آٹھ برسوں کے ماہیوں کا ایک انتخاب پیش کر رہا ہوں تاکہ ماہیے کے معیار کی بات کرتے وقت ایسے ماہیوں کو بھی مدنظر رکھا جا سکے۔

جب اونچی ہوں پروازیں
سنتے نہیں پنچھی
پھر پیڑوں کی آوازیں
(سعید شباب)

OOO

اے میرے سخی داتا
میں کب اجڑا تھا
کچھ یاد نہیں آتا
(احمد حسین مجاہد)

OOO

دکھ سکھ کا میل دکھا
ہنستے گاتے ہوئے
اس ہجر کو جھیل دکھا
(فرحت نواز)

OOO

تصویر نہیں بدلی
عمریں بیت گئیں
تقدیر نہیں بدلی
(اجمل پاشا)

OOO

وہ دور نہیں دیکھا
ہم نے بزرگوں کا
لاہور نہیں دیکھا
(پروین کمار اشک)

OOO

ماہی کبھی آ ملنے
پھول اناروں کے
شاخوں پہ لگے کھلنے
(ضمیر اظہر)

OOO

بے چین نہ ہو ماہیا
آج اکیلے ہیں
کل ہوں گے دو ماہیا
(قاضی اعجاز محور)

OOO

رنگین کہانی دو
اپنے لہو سے تم
گلشن کو جوانی دو
(مناظر عاشق ہرگانوی)

OOO

ہونٹوں پہ مچلتی ہے
پیاس ہے اندر کی
آنکھوں میں بھی پلتی ہے
(نذیر فتح پوری)

OOO

انگلی میں انگوٹھی ہے
سارے زمانے سے
پھر آج وہ روٹھی ہے
(ندیم شعیب)

OOO

بیٹھے ہوئے ناؤ میں
دونوں سلگتے ہیں
اس پریت الاؤ میں
(یوسف اختر)

OOO

صورت مرے بھائی کی
یاد دلاتی ہے
بابا کی جدائی کی
(غزالہ طلعت)

OOO

ساحل پر چھل آئی
کل تجھے آنا تھا
پر تیری نہ کل آئی
(ایم اے تنویر)

لذت ہی نرالی ہے
داور محشر سے
لو ہم نے لگا لی ہے
(رشید اعجاز)

بیری کی گھنی چھاؤں
درد کے ماروں سے
مسعود بھرے گاؤں
(مسعود ہاشمی)

OOO

تاریکیء زنداں ہوں
صبح بنارس تو
میں شام غریباں ہوں
(شجاعت علی راہی)

پانی میں اگے بوٹے
جاگ پڑی آنکھیں
پر خواب نہیں ٹوٹے
(نوید رضا)

سُونا ہے یہ گھر ماہیا
پل پل در کی طرف
اٹھتی ہے نظر ماہیا
(پرویز بزمی*۵)

کیوں شہر ہوا ویراں
تم ہی خبر لینا
داتا کے سجن میراں
(سلطانہ مہر)

OOO

موجوں کے کٹاؤ میں
عمر گذاری ہے
ہم نے ترے چاؤ میں
(عارف فرہاد)

OOO

اشکوں سے بوائی کی
قسمت میں لکھی
تھی فصل جدائی کی
(ثریا شہاب)

OOO

چڑیوں نے چنے تنکے
ترے دوارے ہم
مہمان تھے دو دن کے
(رستم نامی)

OOO

بازار میں سایا ہے
چھوڑ مرا بازو
شاید کوئی آیا ہے
(ذوالفقار احسن)

OOO

اک گندل سرسوں کی
پل میں ٹوٹ گئی
تھی یاری برسوں کی
(شرون کمار ورما)

OOO

مل مجھ سے اکیلی تو
نام سے ان کے اب
مت چھیڑ سہیلی تو
(انور مینائی)

OOO

اک پھول چنبیلی کا
ملنا لگا اچھا
بچپن کی سہیلی کا
(شاہدہ ناز)

OOO

کتنی بے حال ہوئی
کوئی سنبھالے مجھے
میں غم سے نڈھال ہوئی
(ترنم ریاض)

OOO

مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہوولیوں کی
(حیدر قریشی)

بن نیند کے ہی سو جا
خواب کہیں رکھ دے
اور میری طرح ہو جا
(شاہد جمیل)

اردو کے پیاروں کو
اللہ خوش رکھے
سب ماہیا نگاروں کو
(ہمت رائے شرما)

اردو ماہیے کی تحریک کا آغاز ''اوراق'' سے ہوا۔بعض دیگر ادبی رسائل کے اہم اور تاریخی کردار کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ سال بھر کے وقفہ کے بعد جب ''اوراق'' نے اردو ماہیے کے فروغ میں دلچسپی لی تو ایک بڑا ادبی فورم ہمیں مل گیا۔ چونکہ ہمیں اپنے موقف کی سچائی کا مکمل یقین تھا اسی لئے ''اوراق'' میں چھپنے والے مخالفین کے موقف کا فائدہ بھی ہمیں پہنچا۔ ہمارے جوابی موقف سے نہ صرف ماہیے کے خدوخال مزید واضح ہوئے بلکہ اس تحریک کو بڑی ادبی سطح پر مقبولیت بھی نصیب ہوئی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے بعض خطوط نہ صرف میری حوصلہ افزائی کا موجب بنے بلکہ انہوں نے میری درست سمت میں رہنمائی بھی کی۔ آج میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے مضبوط موقف کے خلاف کئے گئے اہم اعتراضات میں سے ایک

اعتراض بھی ایسا نہیں ہے جس کا مدلل جواب نہ دے دیا گیا ہو۔

حاشیہ

*۱: اس شمارہ میں ایم اے تنویر کے درست وزن کے دو عمدہ ماہیے بھی شامل ہیں۔

*۲: سجاد مرزا اب مسلسل درست وزن میں ماہیے کہہ رہے ہیں۔

*۳: ڈاکٹر مناظر عاشق نے ''اوراق'' کے اگلے شمارہ میں اپنے ''تجرباتی ماہیوں'' کے بارے میں خود وضاحت کر دی تھی۔

*۴: انور مینائی اس شمارہ کے بعض ماہیوں میں وزن کے لحاظ سے تھوڑا سا لڑکھڑائے ہیں۔

*۵: برادرم پرویز بزمی سے معذرت کے ساتھ ان کا ماہیا سہ مصرعی فارم میں دے رہا ہوں۔

(مطبوعہ ''اوراق'' لاہور خاص نمبر، جنوری۔فروری 2000ء)

اردو ماہیا 1999ء میں

بیسویں صدی کا آخری سال ماہیے کی مقبولیت میں حیران کن اضافے کا سال بن کر رخصت ہو رہا ہے۔اس سال کے آغاز میں دو شعری مجموعے ''پھر وہی دن کا اجالا'' (نیاز احمد صوفی) اور ''خود سے ایک سوال'' (ثریا شہاب) شائع ہوئے۔ دونوں مجموعوں میں غزلوں اور نظموں کے ساتھ ماہیے بھی شامل تھے۔اس سے یہ واضح ہوا کہ شعراء کرام اس نئی اردو صنف کو ایک باوقار شعری صنف کے طور پر قبول کر رہے ہیں۔اس برس ماہیے کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں قابل ذکر مجموعوں کے نام یہ ہیں۔وہ چاند گواہ میرا (کلیم شہزاد)، موسم سبھی اک جیسے (عاصی کاشمیری)، سب رنگ الفت کے (وسیم عالم)، چھیاں چھیاں (فراغ روہوی)، پھوہار (نسیم فائق)، سوچ سمندر (بخش لائل پوری)، شمیم انجم وارثی نے ''مغربی بنگال میں ماہیا نگاری'' میں 34 ماہیا نگاروں کے کوائف کے ساتھ ان کے منتخب ماہیے مرتب کئے۔ تحقیق اور تنقید کے حوالے سے میری دو کتابیں اسی برس شائع ہوئیں۔ ''اردو ماہیے کی تحریک'' راولپنڈی سے جبکہ ''اردو ماہیے کے بانی۔ ہمت رائے شرما'' دہلی سے شائع ہوئی۔ ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' راولپنڈی نے اپنی اکتوبر کی اشاعت ماہیا نمبر کے طور پر پیش کی۔ ''نیرنگ خیال'' کے مدیر سلطان رشک نے اس سلسلہ میں احمد حسین مجاہد اور محمد وسیم انجم کو مرتبین خصوصی مقرر کیا اور ایک عمدہ نمبر پیش کرنے میں کامیاب رہے۔

''نیرنگ خیال'' کے ماہیا نمبر کے علاوہ دیگر ادبی جرائد میں ''اوراق لاہور''، ''کوہسار''، بھاگل پور، ''سخنور'' کراچی، ''اسباق'' پونہ، ''گلبن'' احمد آباد، ''جدید ادب'' جرمنی، ''عکاس'' وہاڑی، ''شعر و سخن'' مانسہرہ، ''بیاض'' لاہور ماہیے کے فروغ میں پیش پیش رہے۔ دیگر ادبی جرائد میں ''کتاب نما'' دہلی، ''ایوان اردو'' دہلی، ''شاعر'' ممبئی، ''تخلیق'' لاہور، ''صریر''

کراچی،''عوامی منشور'' کراچی،''تیرِ نیم کش'' مراد آباد،''قرطاس'' ناگپور،''انشاء'' کلکتہ،''گل
کدہ''،''سہسوان اور''انتساب'' سرونج کے نام لئے جا سکتے ہیں۔اخبارات میں روزنامہ''جنگ''
لندن، روزنامہ''نوائے وقت'' اسلام آباد، روزنامہ''منصف'' حیدر آباد،''پاکستان لنک'' لاس
اینجلس،''فرائیڈے نیوز'' اسلام آباد،''ویکلی صداقت'' پونہ،''میرٹھ میلہ'' میرٹھ،''سنڈے
ٹائمز'' گوجرانوالہ،''بے باک'' مالیگاؤں،''پاکستان'' انگلینڈ،''راوی'' بریڈ فورڈ اور ویکلی
''صدائے پوٹھوہار'' گوجر خان میں مضامین یا تخلیقات کی صورت میں ماہیے کا چرچا رہا۔ ماہنامہ
''فلمی ستارے'' دہلی اور ماہنامہ''بچوں کی باتیں'' لندن تک بھی ماہیے کا چرچا ہوا۔ جرمنی سے
ارشاد ہاشمی اور جاوید خان کے جاری کردہ باتصویر ماہانہ ادبی خبرنامہ''اردو دنیا'' میں ماہیے کی ایک
دنیا آباد رہی۔

ماہیے کی تنقید اس برس وزن کی بحث سے آگے بڑھ کر ایک طرف تہذیبی و ثقافتی
حوالے سے سامنے آئی تو دوسری طرف ماہیے کے مجموعوں پر لکھے گئے مضامین اور تبصروں سے عملی
تنقید میں وسعت پیدا ہوئی۔اس انداز کے مضامین اور تبصرے لکھنے والوں میں ڈاکٹر مناظر عاشق
ہرگانوی، پروفیسر شوکت واسطی، امین خیال، قیصر شمیم، علقمہ شبلی، ڈاکٹر رفعت اختر، عارف فرہاد،
اختر رضا کیکوٹی، قیصر نجفی، کلیم شہزاد، جان کاشمیری، سلیم انصاری، ارشد خالد، سید اختر الاسلام، نینا
جوگن، اکبر حمیدی اور نیاز احمد صوفی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ماہیے کی عروضی بحث میں احمد
حسین مجاہد، اسلم حنیف، ناوک حمزہ پوری اور شارق جمال ماہیے کی لے کو بنیاد مانتے ہوئے عروضی
پیمانوں کی تلاش میں خلوص کے ساتھ جستجو کرتے رہے۔تحقیقی زاویئے سے میرے دو مضامین''اردو
ماہیے کے بانی۔ ہمت رائے شرما'' اور''اردو ماہیے کے بانی۔ ہمت رائے شرما، فلم خاموشی کے
گیت اور تحقیق مزید'' ڈاکٹر مناظر عاشق کے دو مضامین''فلم خاموشی اور ہمت رائے شرما'' اور
''اردو کے دوسرے ماہیا نگار قتیل شفائی'' شائع ہوئے۔قتیل شفائی نے''کچھ ماہیے کے بارے
میں'' کے زیرِ عنوان ماہیے کے لوک پس منظر کو اجاگر کیا۔ پرویز بزمی نے ماہیے کے تین مصرعوں کی
بجائے ڈیڑھ مصرعوں کی فارم پر اصرار کیا۔ان کا مضمون''اوراق'' میں شائع ہوا اور''اوراق'' ہی

میں میرا جوابی مضمون شائع ہوگیا۔ یوں قصۂ زمین برسرِ زمین ہی نمٹا دیا گیا۔تحقیق و تنقید کی مذکورہ
بالا میری دو کتابوں کے علاوہ مجموعی طور پر اس برس 60 سے زائد مضامین اور تبصرے شائع ہوئے۔
ارشد خالد، قیصر نجفی اور امین خیال کے دو دو تبصرے، عارف فرہاد کے چار مضامین، اختر رضا کیکوٹی
کے پانچ مضامین، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے آٹھ مضامین اور میرے 12 مضامین شائع
ہوئے۔ باقی دوستوں کا ایک ایک مضمون یا تبصرہ شائع ہوا۔''نیرنگِ خیال'' کے ماہیا نمبر میں محمد
وسیم انجم کے اداریہ کو بھی مضمون شمار کیا جانا چاہئے جبکہ''عکاس'' کا اداریہ تو ماہیے کی سہ مصرعی ہیئت
کے مسئلے پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ادھر''اردو دنیا'' میں ارشاد ہاشمی نے ستیہ پال آنند کی ماہیے
کی لوک روایت سے بے خبری کو مدلل کے طور پر اجاگر کیا۔''کوہسار'' کے ایک مباحثہ میں قتیل
شفائی اور شارق جمال کا موقف شائع ہوا۔کلکتہ ریڈیو سے ماہیے کے تعارف پر مبنی فراغ روہوی کا
ایک مضمون نشر ہوا۔غیر مطبوعہ ہونے کے باوجود اسے بھی اس برس کے مضامین میں شمار کیا جا سکتا
ہے۔

اس برس تک ماہیا نگاروں میں اب اتنے چمکتے دمکتے نام آگئے ہیں کہ سب کو اس جائزہ
میں درج کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ ماہیے کے اہم تخلیق کاروں میں امین خیال، اعزاز احمد آذر، بشریٰ
رحمن، شرون کمار ورما، ہیرا نند سوز، کرشن کمار طور، احمد حسین مجاہد، عارف فرہاد، ڈاکٹر صابر آفاقی،
قاضی اعجاز محور، انوار فیروز، سجاد مرزا، خاور اعجاز، سلطانہ مہر، ثریا شہاب، آصف ثاقب، رستم نامی،
سلیم انصاری، فراغ روہوی، نذیر فتح پوری، مناظر عاشق ہرگانوی، نینا جوگن، شاہدہ ناز، بخش لائل
پوری، عاصی کاشمیری، سیما شکیب، عذرا اصغر، شبہ طراز، یاسمین سحر، نسیم فائق، شمیم انجم وارثی، پربھا
ماتھر، عنبر شمیم، فراز حامدی، ترنم ریاض، عبد الاحد ساز، پرکاش تیواری، ارشاد ہاشمی، جاوید خان، سعید
شباب، احمد کمال حشمی، اظہر نیئر، ضمیر یوسف، شاہد جمیل، ناصر نظامی، مسعود ہاشمی، پرویز بزمی، اختر
رضا سلیمی، منور احمد منور، تاج الدین تاج، ثروت محی الدین، امداد نظامی، ایم این اے ریحان، احمد
رئیس، سلطان سکون، یوسف اختر، کلیم شہزاد، سلیم احمد سلیم، زبیر کنجاہی، ذوالفقار احسن، قاضی
حسیب، سہیل اقبال، پرزرق صنم، دلدار ہاشمی، نیاز احمد صوفی، مشتاق احمد تک نام لکھنے کے بعد بھی

مجھے احساس ہو رہا ہے کہ کم از کم اتنے ہی اور اہم ماہیا نگاروں کے نام ابھی مزید درج کئے جا سکتے ہیں۔اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما اور ماہیے کے ایک اہم پیش رو قتیل شفائی کے تازہ ماہیے بھی اس برس شائع ہوئے۔

ماہیا نگاری کے مختلف رویوں میں پنجابی مزاج اور پنجابی لفظیات سے مزین اردو ماہیے کہنے کا رویہ مقبول رہا تاہم پنجابی لفظیات سے ہٹ کر بھی بے حد عمدہ ماہیے کہے گئے۔پنجاب سے جغرافیائی لحاظ سے دور دراز کے علاقوں میں ایک طرف نامانوس قسم کے ماہیے سامنے آئے تو دوسری طرف بعض ماہیے حیرت انگیز طور پر ماہیے کی مانوس فضا لئے ہوئے تھے۔بچوں کے لئے ماہیے کہنے کا دلچسپ تجربہ کیا گیا اور پیروڈی کے انداز میں ماہیے کہنے کا تجربہ بھی کیا گیا۔فکری گہرائی کا احساس دلانے والے ماہیے بھی سامنے آئے۔ایسے ماہیوں کی چند مثالیں یہاں پیش کرنے سے ماہیے کے سفر کی نوعیت کا بہتر اندازہ کیا جا سکے گا۔

کھڑکی میں چندا ہے
عشق نہیں آساں
یہ روح کا پھندا ہے
(بشریٰ رحمٰن)

چھاگل بھر دیتی ہے
کثرت خوشیوں کی
پاگل کر دیتی ہے
(امین خیال)

فریاد نہیں کرتے
درد کی دولت کو
برباد نہیں کرتے
(علقمہ شبلی)

ممکن نہیں چھپ جانا
انٹرنیٹ میں تجھے
ڈھونڈے ترا دیوانہ
(ارشاد ہاشمی)

مجھے اپنا کر ڈالا
پھولوں سے ماہی نے
مرا دامن بھر ڈالا
(ترنم ریاض)

سانسوں میں گھٹن جیسا
کون چھپا ہے یہ
سینے میں چبھن جیسا
(سلطانہ مہر)

بازار میں سایا ہے
چھوڑ مرا بازو
شاید کوئی آیا ہے
(ذوالفقار احسن)

برسات ہے رنگوں کی
چڑھتی جوانی ہے
ہولی ہے امنگوں کی
(قیصر شمیم)

یہ کیسی کہانی ہے
دور تلک جس میں
راجہ ہے نہ رانی ہے
(فراغ روہوی)

اک اشک قبول ہوا
جاگتی آنکھوں پر
خوابوں کا نزول ہوا
(احمد حسین مجاہد)

دریا کے بہاؤ میں
ڈوب گئے ہم بھی
گوری ترے چاؤ میں
(عارف فرہاد)

گرداب میں رہتے ہیں
تجھ کو پا کر بھی
ہم خواب میں رہتے ہیں
(تاج الدین تاج)

اس انداز کے ماہیوں سے اس برس کی ماہیا نگاری کے رویوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور ماہیے کے روشن امکانات کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ماہیے کے سلسلے میں اس برس متعدد تقریبات بھی ہوئیں۔''چھیاں چھیاں'' اور ''پھوہار'' کی رسم اجراء کلکتہ میں ہوئی۔''موسم سبھی اک جیسے'' کی تقریب رونمائی ''نوٹنگھم'' انگلینڈ میں ہوئی۔''وادی کوکن'' کی تقریب ممبئی میں ہوئی۔کلکتہ میں ایک بڑا اہم ماہیا مشاعرہ ہوا جس میں علاقے کے تمام اہم شعراء نے ماہیے سنائے۔پونہ میں دو ماہیا مشاعرے ہوئے۔دہلی کے ایک سہ روزہ سیمینار میں ماہیے کے بارے میں متعدد سوال پوچھے گئے اور حاضرین نے ماہیے کو سمجھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ان تقریبات میں مجموعی طور پر علقمہ شبلی، قیصر شمیم، ڈاکٹر مناظر عاشق، فراغ روہوی، انیس دہلوی، سیفی سرونجی، شمیم انجم وارثی، عاصی کاشمیری، ایوب مرزا، یعقوب مرزا، شوکت واسطی، ساحر شیوی، نذیر فتح پوری، افتخار امام صدیقی، کالی داس گپتا رضا، دلدار ہاشمی، اقبال حمید، پربھا ماتھر، ف س اعجاز، عاصم شہنواز شبلی اور ترنم ریاض جیسے اہم ادباء نے کسی نہ کسی حوالے سے اہم نوعیت کی شرکت کی۔یہ ساری اہم تقریبات پاکستان سے باہر ہوئی ہیں۔صرف ایک تقریب انگلینڈ میں اور باقی سب انڈیا میں۔اس پر مجھے اسی برس ''جنگ'' لندن میں چھپنے والے بشیر بدر کے یہ الفاظ یاد آ گئے ہیں۔ادب میں نئے تجربات کے سوال پر انہوں نے کہا ''تجربے ہوتے رہنے چاہئیں......ماہیے بھی لکھے جا رہے ہیں، پنجاب میں اس کا سکوپ زیادہ ہے۔''بشیر بدر نے جس تناظر میں یہ بات کہی ہے بالکل درست ہے لیکن ماہیے کی مذکورہ بالا تقریبات کے خاکے سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ماہیے نے پنجاب سے باہر کہیں زیادہ گھما گھمی پیدا کر رکھی ہے۔

بیسویں صدی کے اس آخری سال کے حوالے سے اطمینان بخش طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو ماہیا اپنے ممکنات کے ساتھ، اپنی ساری کامیابیاں اور کامرانیاں لئے ہوئے، باوقار طور پر اکیسویں صدی میں داخل ہو رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں ماہیا ایک شعری صنف کے طور پر اردو میں اپنی جڑیں مزید گہری کرے گا اور اپنے درخت کی پہچان اپنے پھل سے کرائے گا۔

(انشاءاللہ)

(مطبوعہ ادبی صفحہ ڈیلی جنگ لندن۔ ۲۷؍جنوری ۲۰۰۰ء
قرطاس۔ ناگپور، انڈیا، ماہیا نمبر۔ مئی تا اگست ۲۰۰۰ء)

مرزا صاحب کے جواب میں

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اپنے مضمون ''اردو ماہیا میں اولیت کا قضیہ'' (مطبوعہ جدید ادب جرمنی۔ مئی ۲۰۰۰ء) میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر ادبی اور علمی سطح پر تو بات ہوتی رہے گی۔ مجھے سب سے پہلے اس افسوس کا اظہار کرنا ہے کہ ماہیے کے حوالے سے اردو میں ہونے والے کام سے پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باعث حامد بیگ نے ہمت رائے شرما کی نسبت ایسے نازیبا الفاظ استعمال کئے ہیں جنہیں محتاط ترین لفظوں میں بھی ان کی تحقیقی جہالت کہنا چاہئے۔ اس سے ان کا اخلاقی رویہ بھی سامنے آیا ہے۔ انہوں نے جن مفروضوں کی بنیاد پر ہمت رائے شرما جی کی اہانت کی ہے، پہلے تو وہ مفروضے خود ان کی اپنی کم علمی کا مظہر ہیں۔ یہ گھٹیا الزام کہ ہمت رائے شرما جی نے فلم ''خاموشی'' کی بک لیٹ جعلی طور پر تیار کی ہے، یا کم از کم اس میں مئی 1936ء کی تاریخ انہوں نے خود لکھوالی ہے، سراسر بہتان ہے اور اس میں ذاتی طور پر اس کی کھلے لفظوں میں تردید کرتا ہوں کیونکہ میں ان سے خط وکتابت کے علاوہ متعدد بار ٹیلی فون پر بات کر چکا ہوں۔ وہ طویل عرصہ سے فالج کا شکار ہیں۔ بات کرتے کرتے کئی بار بات بھول جاتے ہیں ذرا سی بات پر بچوں کی طرح بلکنے لگتے ہیں۔ ایسی حالت اور ایسی کیفیت کا حامل کوئی شخص ایسی کاریگری نہیں کر سکتا جو مرزا حامد بیگ نے ان سے منسوب کر دی ہے۔ حامد بیگ نے اگر شرما جی کے تعلق سے میری دوسری تحریریں بھی تحقیقی زاویے سے پڑھ لی ہوتیں تو اس تحقیقی جہالت اور بداخلاقی کے مرتکب نہ ہوتے ۔شرما جی کی علالت اور مذکورہ کیفیت کا میں اپنے مضمون 'اردو ماہیے کے بانی۔ ہمت رائے شرما' مطبوعہ ''انشاء'' کلکتہ شمارہ ستمبر۔ اکتوبر 1998ء اور ''اوراق'' لاہور شمارہ جنوری۔ فروری 1999ء میں ذکر کر چکا ہوں۔ حامد بیگ نے وہ مضمون پڑھ رکھا ہوتا تو جعل سازی کا گھٹیا الزام لگانے میں اتنی

دلیری نہ دکھاتے۔

ماہیے کی بحث شروع ہونے سے کئی سال پہلے 1984ء میں ہمت رائے شرما جی کا شعری مجموعہ ''شہاب ثاقب'' شائع ہوا تھا۔اس میں شرما جی کے وہی دس ماہیے شامل ہیں جو فلم ''خاموشی'' سے منسوب ہیں۔اسی مجموعہ کے فلیپ پر شرما جی کے تعارف میں یہ الفاظ بھی درج ہیں:

''ہمت رائے شرما ایک با کمال فنکار ہیں۔23 نومبر 1919ء کو شرما صاحب نارووال ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔17 سال کی عمر میں فلم ''خاموشی'' کے گیت لکھے''۔

1984ء میں ہمت رائے شرما جی کو یا ان کے تعارف نگار کو کوئی ایسی غرض لاحق نہ تھی کہ ایسی بات لکھ کر خود کو ماہیے کا بانی بنوانا ہے، کیونکہ تب ماہیے کا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ویسے مرزا حامد بیگ جیسے محقق یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شرما جی نے تب سے ہی پلاننگ کر لی تھی۔

جہاں تک ''خاموشی'' کے اداکاروں شیام،منورما اور رمولا کے حوالوں کا تعلق ہے ان پر مزید تحقیق کی جا سکتی ہے۔ضروری نہیں ہے کہ عمروں کے بیان میں پوری احتیاط سے کام لیا گیا ہو۔فرض کر لیں منورما 1936ء میں نو سال ہی کی ہو،فلم اسی سال شروع کی گئی ہو لیکن مکمل قدرے تاخیر سے کی گئی ہو۔آخر مشہور فلم ''مغلِ اعظم'' بھی تو لگ بھگ تیرہ سال کے بعد جا کر مکمل ہوئی تھی اور اس زمانے میں بہت ہی کم عمر کی لڑکیاں فلموں میں آتی رہی ہیں۔مثلاً مشہور فلمی ویمپ للیتا پوار جو شروع میں ہیروئن آئیں،گیارہ برس کی عمر میں فلموں میں آئیں۔معروف گلوکارہ اور ہیروئن ثریا کلیانی (اصل نام زرینہ)،پروڈیوسر ولی کی بیوی اور اپنے زمانے کی مشہور ہیروئن ممتاز شانتی یہ نام تو مجھے فوراً یاد آ گئے ہیں۔یہ سب گیارہ برس کی عمر میں فلموں میں آ گئی تھیں۔لہٰذا کم عمری کا بہانہ کر کے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔تحقیقی حوالے سے مرزا حامد بیگ اس لئے بھی قابل اعتبار نہیں رہتے کہ وہ ماہیے کی اب تک کی تحقیقی پیش رفت سے ہی غافل ہیں۔انہوں نے فلم ''باغبان'' بننے کا سال 45-1944ء بیان کیا ہے جبکہ یہ سال 1937ء ہے۔جب دستیاب معلومات کے باوجود غفلت کا یہ عالم ہے تو پھر تحقیق کرنے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔میرے لئے حقائق محترم ہیں لیکن مفروضے نہیں۔کسی مفروضے کے ذریعے کسی حقیقت تک پہنچنے میں مدد

تو لی جا سکتی ہے لیکن مفروضے کو ہی اصل حقیقت نہیں مانا جا سکتا۔

ماہیے کی ابتدا کے حوالے سے حسرتؔ کے جن ''ماہیوں'' کا ذکر ہوتا ہے، ان کا سرا تو اب 1937ء سے بھی تھوڑا پیچھے تک جا ملتا ہے۔بات 1936ء تک پہنچ رہی ہے اور حامد بیگ صاحب ہمیں 1945ء سنا رہے ہیں۔چونکہ حسرتؔ کے ''ماہیوں'' کا 1936ء میں لکھے جانے کا ذکر آ گیا ہے تو اس سلسلے میں بھی اپنی تازہ معلومات بیان کئے دیتا ہوں۔حمید نسیم نے اپنی کتاب ''ناممکن کی جستجو'' کے صفحہ 44 اور 46 پر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ڈاکٹر تاثیر جنوری 1936ء میں ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں پرنسپل بن کر آئے۔انہوں نے آتے ہی ایک مشاعرہ برپا کرایا جس میں صوفی تبسم، پنڈت ہری چند اختر،مولانا سالک اور چراغ حسن حسرتؔ کو لاہور سے مدعو کیا گیا۔اسی مشاعرہ میں حسرت نے اپنے مشہور مبینہ ''ماہیے'' پہلی بار سنائے۔اس بیان کے مطابق حسرتؔ نے اگر جنوری 1936ء میں ''ماہیے'' سنائے ہیں تو ان کا سالِ تخلیق بھی کم از کم جنوری 1936ء بنتا ہے۔یوں انہیں زمانی طور پر شرما جی پر فوقیت مل سکتی ہے۔لیکن ایک اور حوالہ ملنے سے حسرت کا سالِ تخلیق تو 1936ء رہتا ہے لیکن انہیں شرما جی پر زمانی فوقیت نہیں رہتی۔ہر لحاظ سے شرما جی کو ان پر فوقیت رہتی ہے۔اور وہ حوالہ **''مسلم انڈینز آف بائیوگرافیکل ڈکشنری'' از احمد سعید ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری، ایم۔اے۔او کالج لاہور کا ہے۔اس کتاب کے صفحہ نمبر 327 پر ڈاکٹر تاثیر کے جو کوائف درج کئے گئے ہیں ان میں یہ واضح طور پر درج ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نے ایم۔اے۔او کالج امرتسر کے پرنسپل کی حیثیت سے 20 مئی 1936ء کو کام شروع کیا۔سو اگر انہوں نے آتے ہی مشاعرہ کرایا اور اس سلسلے میں آٹھ دس دن لگ گئے تو مشاعرہ کا مہینہ جون بنے گا۔اگر حسرت نے جون 1936ء میں ''ماہیے'' سنائے تو یہ ''خاموشی'' کے گیت تخلیق ہونے اور بک لٹ چھپنے کے بعد کی بات ہو جاتی ہے۔تاہم اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حسرت نے اپنے ''ماہیے'' 1936ء میں تخلیق کئے تھے اور یہ 1937ء میں فلم ''باغباں'' میں شامل بھی کر لئے گئے تھے۔**
اب ایک طرف تحقیق کا یہ مرحلہ ہے، دوسری طرف ہمارے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ہیں جو حسرتؔ کے ''ماہیے'' 45-1944ء میں ہونے کا حکم سنا رہے ہیں۔اور ایسی تحقیق کے زعم میں ہم لوگوں کے کام کو

’’تحقیق پر آیا ہوا براوقت‘‘ کہہ کر طنز بھی فرمارہے ہیں۔ظاہر ہے ایسے ’’محقق‘‘ ہی ایسا حکم صادر کر سکتے ہیں۔پھر بھی انہیں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ کسی کے ایک آدھ مضمون کو آدھا ادھورا پڑھ کر اور کسی اور آدھے ادھورے حوالے کی بنیاد پر نام نہاد تحقیق کی جائے تو ہلدی کی گانٹھ ملنے پر پنساری بننے والی مثال فٹ بیٹھ جاتی ہے۔

میں نے اپنے مضمون ’’اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما‘‘ میں یہ واقعہ بھی لکھا تھا،

☆ایک تقریب میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے یہ گیت سنا:اک بار تو مل ساجن ر آکر دیکھ ذرا رٹوٹا ہو دل ساجن...........انہوں نے غور کیا تو محسوس کیا کہ یہ تو ماہیا ہے۔بس پھر انہوں نے تحقیق شروع کر دی کہ یہ کس نے لکھا ہے اور یوں ہمت رائے شرما کا نام انہیں معلوم ہوا۔پھر خاصی تگ ودو کے بعد وہ انہیں تلاش کر سکے۔

ڈاکٹر مناظر نے کسی تقریب میں گیت سنا اور وہ ماہیا نکلا۔ظاہر ہے وہ پرانا گیت ابھی تک کسی نہ کسی روپ میں موجود ہے تو کسی تقریب میں سنا گیا۔کتنا اچھا ہو کہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اب اس کے حصول کے لئے ہی تحقیقی زاویے سے تھوڑی محنت کر لیں۔انڈیا میں ان کے کئی دوست ان کی مدد کر سکتے ہیں۔علاوہ ازیں ہمت رائے شرما جی کے سارے ماہیے ان کے شعری مجموعہ ’’شہاب ثاقب‘‘ میں بھی شامل ہیں اور یہ مجموعہ ماہیے کی حالیہ بحث سے کہیں پہلے(بیس سال کی تاخیر کے باوجود)1984ء میں چھپ چکا ہے۔ان حقائق کے ہوتے ہوئے مرزا حامد بیگ کا ایسے سوال اٹھانا ان کی جہالت ہے یا پھر دیدہ دانستہ شرارت ہے کہ:

’’فلم’’خاموشی‘‘ کے لئے اردو ماہیے ہمت رائے شرما نے لکھے بھی تھے یا نہیں؟ کیا فلم میں یہ ماہیے شامل کئے گئے؟اور اگر فلم میں یہ ماہیے شامل کئے گئے تو فلم کا گیت کار ہمت رائے شرما کون تھا؟ جب تک سنیما اسکرین پر یا وڈیو کیسٹ کے ذریعے فلم’’خاموشی‘‘ کے تعارفی ٹائٹلز میں ہمت رائے شرما کا نام نہ دیکھ لیا جائے تب تک یہ معاملہ التوا میں رہے گا‘‘۔

جب ہمت رائے نام ملنے پر بھی آپ نے یہ شرارت کرنی ہے کہ یہ گیت کار ہمت رائے کون ہے؟ تو ٹائٹل پر ان کا نام مل جانے کے بعد بھی آپ کا یہ سوال تو قائم رہے گا۔سوتا دمِ

تحریر دستیاب حقائق کی بنیاد پر ہمت رائے شرما جی نے مئی 1936ء سے پہلے،اردو میں سب سے پہلے ماہیے لکھے تھے اور وہی اردو ماہیے کے بانی ثابت ہوئے ہیں۔

اب میں مرزا حامد بیگ کے مضمون کے بنیادی موضوع سے ہٹ کر ان کی بیان کردہ بعض دوسری باتوں کی طرف آتا ہوں۔اس سلسلے میں پہلے ان کی تین خوبیوں کا ذکر......انہوں نے ماہیے کے تینوں مصرعوں کا ہم وزن ہونا غلط سمجھا ہے اور اسے ’’دوسرے مصرعہ کی سطح پر ایک بیٹ زائد ہونے کی خرابی‘‘ قرار دیا ہے۔پھر انہوں نے ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ کے ’’ماہیے‘‘ نہ صرف دریافت کئے ہیں بلکہ ان کے دوسرے مصارع میں جو خامی رہ گئی ہے اس کی بھی بڑی حد تک نشاندہی کر دی ہے۔تیسری خوبی یہ کہ انہوں نے اردو کے تین معروف شعراء محمد خالد،غلام حسین ساجد اور ابرار احمد سے ماہیے کہلوائے اور اپنی طرف سے انہیں بطور ماڈل پیش کیا۔ان ماہیوں سے ہمارے مؤقف کو کئی لحاظ سے زبردست تقویت ملی ہے۔

یہ تین خوبیاں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا کریڈٹ ہیں۔کاش انہوں نے ہمت رائے شرما جی کے حوالے سے غیر ضروری حد تک برہمی نہ دکھائی ہوتی اور اپنی اس تحقیق کو بھی سلیقے سے بیان کیا ہوتا تو مجھے جواباً تلخ نہ ہونا پڑتا اور ان کا مضمون اردو ماہیے کے فروغ میں ایک اہم مضمون بن جاتا۔بہرحال مذکورہ تینوں شعراء کے چند ماہیے یہاں بطور حوالہ پیش کر رہا ہوں:

یہ قرض ہوا چکتا
دل تو مسافر تھا
سینے میں میں کہاں رکتا

اٹھلا کر رات چلی
ہجر کے ماروں میں
پھر تیری بات چلی

کوئی میٹھا بول میاں
ہے یہ خلش کیسی
ذرا دل کو ٹٹول میاں

☆☆☆ (محمد خالد)

جی دے کر جی لیتے
رو کر کیا پایا
کچھ آنسو پی لیتے

مشکل میں ہے جاں میری
سپنے لوٹ آئے
آنکھیں ہیں کہاں میری

کوئی نور بھرا سایا
خواب کے کھلنے کا
موسم ہی نہیں آیا

☆☆☆ (غلام حسین ساجد)

مٹی ہے زمانوں کی
بھول گئے خوشبو
آبائی مکانوں کی

کوئی آنکھیں ملتا ہے
دل جب زور کرے
پھر بس کب چلتا ہے

کیا رنگ برستے ہیں
ہم تری بستی میں
روتے ہیں نہ ہنستے ہیں

☆☆☆ (ابرار احمد)

اب ذرا ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مضمون کی بعض دیگر غلطیوں اور غلط فہمیوں کی نشاندہی بھی کر دوں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ''ماہیا کے عروضی آہنگ اور دیگر فنی لوازم پر بات نہ ہونے کے برابر ہوئی ہے''۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اپنی بے خبری ہے وگرنہ اس حوالے سے خاصی بحث بلکہ گرما گرمی ہو چکی ہے۔ چند اہم ادبا کے نام لکھ رہا ہوں جنہوں نے اس مسئلے کو عروضی حوالے سے گہرائی کی حد تک سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یوسف علی لائق، شارق جمال، ناوک حمزہ پوری، احمد حسین مجاہد، عارف فرہاد، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی۔ یہ تو وہ نام ہیں جنہوں نے عروضی حوالے سے خاصی محنت کی ہے۔ ان کے علاوہ بہت سارے ادیبوں نے بھی عروضی زاویے سے تھوڑا بہت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ناوک حمزہ پوری نے اپنے ایک مضمون میں ماہیے کی لوک لے اور عروضی ضابطوں پر گفتگو کرتے ہوئے یہ لکھا ''عروض کو آہنگ کے تابع ہونا چاہیے نہ کہ آہنگ ہی کو عروض کا غلام بنا دیا جائے'' اس بنیادی اصول کے بعد انہوں نے ماہیے کی لے سے مطابقت رکھنے والے عروضی اوزان بھی دریافت کئے۔ احمد حسین مجاہد نے مختلف عروضی اوزان میں تسکین اوسط کے عروضی اصول کی بنیاد پر ہم آہنگی کو اجاگر کیا ہے۔ مجھے علم عروض سے زیادہ واقفیت نہیں ہے پھر بھی اپنی بساط کے مطابق میں نے ماہیے کی دھن کو بنیاد بنا کر اس پر پورے اترنے والے اوزان کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں اپنے مضمون ''ماہیا پابندِ لے ہے'' میں میں نے پانچ اوزان، جبکہ اپنے تفصیلی خط ''ایڈیٹر ایوانِ اردو۔ دہلی کے نام'' (یہ خط ایوانِ اردو میں چھپ چکا ہے، میری کتاب ''اردو ماہیے کی تحریک'' میں بھی شامل ہے) میں آٹھ اوزان یکجا کر چکا ہوں۔ میرا شروع سے یہ موقف رہا ہے کہ۔

اردو ماہیے کے وزن کی بنیاد ماہیے کی لوک لے ہے۔ جو ماہیا اپنی فطری روانی کے ساتھ اس لے پر پورا اترتا ہے وہ ماہیا ہے۔ اب وہ عروضی لحاظ سے کسی بھی پیمانے کے مطابق ہو،

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی تحریک پر محمد خالد، غلام حسین ساجد اور ابرار احمد نے جو ماہیے لکھے ہیں وہ بالکل اسی وزن کے مطابق ہیں جس پر ہمت رائے شرما نے ماہیے لکھے تھے۔ اور یہ وہی وزن ہے جس کی بنیاد پر ہم گزشتہ دس برس سے ماہیا نگاری کے فروغ کیلئے کوشاں ہیں۔

ڈاکٹر حامد بیگ اپنے مضمون میں ماہیے کے وزن کی تفہیم میں ہمارے ہی موقف کے حامی ہیں۔ میں اس اتفاق کو مستقبل میں ماہیے کے لئے نیک فال محسوس کرتا ہوں بشرطیکہ وہ میرے ترکی بہ ترکی جواب سے مخالفت برائے مخالفت پر نہ اتر آئیں۔ اس کا ایک ثبوت تو وہ ماہیے ہیں جو ان کی تحریک پر تین شعراء نے لکھے۔ دوسرا ثبوت انکا یہ رویہ ہے کہ انہوں نے حسرتؔ اور غلام جیلانی برقؔ کے ''ماہیوں'' کے دوسرے مصرعوں میں غلط وزن کی بجا طور پر نشاندہی کی ہے۔ تاہم چونکہ وہ شاعر نہیں ہیں اس لئے جہاں عروضی حساب کتاب کرنے لگے ہیں وہیں ان سے گڑبڑ ہوگئی ہے۔ یہ اصولی بات کرنے کے باوجود کہ ''ماہیا کی دوسری لائن، پہلی اور تیسری لائن سے ایک Beat کی کمی کے ساتھ مختصر ہوتی ہے'' جب وہ ماہیے کا عروضی نقشہ یوں بتاتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے:

فعلن فعلن فع / فعلاتن فعلن فع / فعلن فعلن فع

محمد خالد، غلام حسین ساجد اور ابرار احمد کے ماڈل ماہیے ایسے کسی وزن پر پورے نہیں اترتے اور نہ ہی یہ ماہیے کا وزن ہے۔ تاہم اسے اس سبب سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار حامد بیگ کو عروض کا علم نہیں ہے۔ انہوں نے یہ مشورہ دیا ہے ''پنجابی ماہیا سے متعلق صدیوں سے مقررہ دھن کو بنیاد بنایا جائے'' یہ بے حد صائب مشورہ ہے۔ ہم لوگ گزشتہ دس برس سے یہی گزارش اور اصرار کرتے آ رہے ہیں۔ سو یہاں ہمارے مؤقف میں ہم آہنگی خوش کن ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے ماہیے کے لئے تکنیکی سطح پر چند اہم مشورے بھی دیئے ہیں (الف) ''ماہیا میں برتے جانے والے الفاظ کو فارسی عروض پر کس کر سپاٹ بنانے سے گریز کیا جائے، یوں اردو ماہیا پنجابی ماہیا کی طرح وادل ساؤنڈز کو گرا کر جو کام لیا جاتا ہے، وہ بھی دکھائی دے جائے گا''۔

اردو عروض میں زحافات کی رعایت موجود ہے اور اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

میں بنیادی اہمیت ماہیے کی دھن کو دیتا ہوں۔ چنانچہ جب ماہیے کی لے والے بعض ماہیوں پر عروضی حوالے سے اعتراض ہوئے، میں نے ان کی تردید کی۔اس سلسلے میں سہ ماہی ’’اسباق‘‘ پونہ کے شمارہ جولائی تا ستمبر 1999ء میں شائع شدہ اپنے ایک خط کا اقتباس یہاں درج کئے دیتا ہوں تا کہ اندازہ کیا جا سکے کہ میں اس مشورے پر پہلے سے عمل کر رہا ہوں:

’’محترم اسلم حنیف صاحب ماہیے کے سلسلے میں زیادہ گہرائی میں چلے گئے ہیں۔جس کی ماہیے کو اتنی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے امین خیال اور بشریٰ رحمٰن کے جن ماہیوں پر اعتراض کئے ہیں مناسب نہیں ہیں۔لفظ ’ماہیا‘ پنجابی تلفظ میں ’’مایا‘‘ بھی بولا جاتا ہے اور مذکورہ ماہیوں میں پنجابی تلفظ ہی لکھا گیا ہے۔ چونکہ اسلم حنیف صاحب اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں اسی لئے مغالطہ میں مبتلا ہو گئے۔انہوں نے جو دوسرے اعتراض کئے ہیں وہ بھی اس وجہ سے غیر اہم ہو جاتے ہیں کہ زیرِ اعتراض سارے ماہیے۔ ماہیے کی لے پر پورے اور کھرے اترتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ امین خیال جیسے پنجابی زبان کے اہم شاعر کو ماہیے کا وزن اسلم حنیف صاحب بتائیں گے تو بات خاصی مضحکہ خیز ہو جائے گی‘‘۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا ایک مشورہ بایں الفاظ ہے:

’’ماہیے میں پہلی لائن کا تعلق براہِ راست دوسری اور تیسری لائن کے ساتھ دکھائی نہ دے لیکن تینوں لائنوں میں ایک باطنی ربط ضرور ہو جو پہلی لائن کو دہرا کر پڑھنے سے اپنا پتہ دے‘‘......اس حوالے سے بھی گزارش ہے کہ ہمارے اچھے ماہیا نگار ان امور کو اپنے اپنے ڈھنگ سے پہلے ہی ملحوظ رکھ رہے ہیں اور میں نے اپنے بعض مضامین میں ان کی نشاندہی بھی کی ہے۔ بطور نمونہ یہ مثالیں کافی رہیں گی:

1۔ ’’کلیم شہزاد کے ہاں پہلے مصرعہ کا چوتھی لائن میں دہرایا جانا معنوی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے کسی داخلی حوالے تک بھی لے جاتا ہے۔ان کے یہ ماہیے دیکھیں اور ان کے مصرعوں کے ربطِ باہم سے پیدا ہونے والے معنوی تسلسل پر غور کریں۔

سب کچھ تھا اشاروں پر
جیون پیاسا تھا
دریا کے کناروں پر
سب کچھ تھا اشاروں

پانی تو بھرنا ہے
میرا دلبر تو
اک پیار کا جھرنا ہے
پانی تو بھرنا ہے

جیون یہ بنا روگی
دکھ زنجیریں ہیں
خوشیوں نے سزا بھوگی
جیون یہ بنا روگی

ان ماہیوں میں پہلا مصرعہ چوتھی لائن میں آکر پورے ماہیے کے معنوی ربط میں ایک نئے بُعد کا اضافہ کر رہا ہے۔ پھر تیسرے اور چوتھے مصرعوں کے معانی کی الگ سے کونپل پھوٹتی محسوس ہوتی ہے‘‘ (پیش لفظ ’’دہ چاند گواہ میرا‘‘ از حیدر قریشی۔کتاب مطبوعہ جنوری 1999 لاہور)

2 ’’امین خیال کے ماہیوں میں پنجابی ماہیے کی روایت کے اثرات بہت واضح ہیں۔ پنجابی ماہیے میں بعض اوقات پہلے مصرعے کا باقی ماہیے سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور بعض اوقات سرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یا بہت ہی مبہم سا تعلق ہوتا ہے۔امین خیال کے ہاں تینوں مصرعوں کے بامعنی تعلق کی تو کئی مثالیں ہیں تاہم ایسے ماہیے بھی موجود ہیں جن میں نفسِ مضمون کے لحاظ سے پہلا مصرعہ باقی ماہیے سے الگ تھلگ دکھائی دیتا ہے‘‘ (پیش لفظ ’’یادوں کے سفینے‘‘ از حیدر قریشی۔کتاب مطبوعہ 1997ء گوجرانوالہ)

سو حامد بیگ کا یہ مفید مشورہ ایک اچھی یاد دہانی ہے جو ماہیے کی خوبصورتی میں اضافہ کے لئے ہوتی رہنی چاہے اور اس کی مزید پرتیں بھی واضح ہوتی جانی چاہئیں۔ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے ایک اور عمدہ مشورہ یہ دیا ہے کہ ’’ماہیا آسان سمجھ کر نہ کہا جائے اس لئے کہ پنجابی ماہیا میں جب تک احساس کی سطح پر گہری مار نہ ہو، ماہیا شمار ہی نہیں ہوتا۔اس ضمن میں پنجابی کے عمدہ ماہیے ماڈل کے طور پر سامنے رکھے جا سکتے ہیں‘‘......اس مشورہ کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اسی بات کو ماہیے کے مزاج کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا، ناصر عباس نیر اور خاور اعجاز بہت پہلے کہہ چکے ہیں۔ میں نے بھی اپنے خیالات کا تھوڑا بہت اظہار کیا ہے۔ دوسری تمام ادبی اصناف کی طرح ماہیے میں بھی ہر طرح کے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔اچھا لکھنے والے، بہت اچھا لکھنے والے، برا لکھنے والے، بہت برا لکھنے والے، اوسط درجے کا لکھنے والے۔سو آسان سمجھنے اور نہ سمجھنے میں تخلیق کار کی تخلیقی قوت کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔میں نے اپنے اولین مضمون میں بھی اور اپنی کتاب ’’اردو

میں ماہیا نگاری'' کے آغاز میں بھی پنجابی ماہیے کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ تاہم میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ پنجابی ماہیا ''خودرو جنگل'' کا حسن لئے ہوئے ہے اور اردو ماہیے کو ''خودرو جنگل'' سے ''آراستہ گلشن'' تک کا سفر کرنا ہے۔ لگے بندھے موضوعات اور انداز سے آگے جانا ہے، لیکن اپنی اصل اور بنیاد سے منسلک رہتے ہوئے یہ سفر کرنا ہے۔ بہرحال مرزا حامد بیگ کا یہ مشورہ بھی ایک اچھی یاددہانی ہے اور اس کے لئے میں خود بھی ان کا شکرگزار ہوں۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مضمون میں ایک دو علمی لغزشیں ایسی ہیں جنہیں میں دانستہ نظر انداز کر رہا ہوں۔ اس حسن ظن کے ساتھ کہ وہ اپنی گرم مزاجی کے باوجود ماہیے کے تئیں بڑی حد تک مفید دکھائی دے رہے ہیں۔ ہماری جدید نظم اور جدید غزل چند مستثنیات کو چھوڑ کر انتہا پسند تجربوں کے نتیجہ میں دھرتی سے کٹ سی گئی ہے۔ بعض اچھے شعراء جو اپنی انفرادیت رکھتے ہیں وہ بھی اس نامانوس فضا میں معلق دکھائی دینے لگے ہیں۔ ایسے وقت میں جب اردو شاعری میں سہ مصرعی اصناف کی جستجو بڑھتی جا رہی تھی، ماہیے کا نمایاں ہو کر اُبھر آنا واضح کرتا ہے کہ سہ ماہی اصناف میں بھی ماہیا ہی طاقتور شعری صنف ہے اور اس کے ذریعے سے جہاں ابھی اور بہت سی اہم باتیں سامنے آئیں گی، وہیں یہ تو سامنے کی بات ہے کہ ماہیا اردو شاعری کے انتہا پسند جدیدیت کے تجربوں کو خلا سے پھر زمین کا، دھرتی کا احساس دلا رہا ہے۔ جن تین شعراء نے مرزا حامد بیگ کی تحریک پر ماہیے لکھے ہیں وہ عمومی طور پر اچھی شاعری کر رہے ہیں لیکن اگر وہ غور کریں تو کہیں کہیں وہ بھی جذبوں سے دور ہو کر، گہری فکر کے چکر میں نامانوس فضا میں کھو جاتے ہیں۔ یہ ان کا عمومی رنگ نہیں لیکن کہیں کہیں وہ اس کا شکار ضرور ہوئے ہیں مجھے یقین ہے کہ یہ شعراء اگر اسی طرح ماہیے کہتے رہے تو ماہیے کی پیدا کردہ کیفیت خود ان کی دوسری شاعری کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

جہاں تک اردو ماہیے کے بانی کے نام کا تعلق ہے۔ پہلے پہل چراغ حسن حسرت کو بانی سمجھا گیا تھا۔ جب ہم نے اصلاحِ احوال کا سلسلہ شروع کیا تب قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی کے نام سامنے آئے۔ تحقیق میں پیش رفت ہوئی تو قتیل شفائی اور ہمت رائے شرما جی

کے نام سامنے آگئے۔ اب حسرتؔ کی طرح جناب غلام جیلانی برقؔ کے ''ماہیے'' بھی نہ صرف سامنے آگئے ہیں بلکہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے ان کا مناسب تجزیہ بھی کر دیا ہے۔ اسے کسی کی تردید یا تذلیل کی بجائے تحقیقی پیش رفت کے طور پر لیا جانا چاہئے۔ سردست برقؔ صاحب (میں فکری طور پر انکی بہت عزت کرتا ہوں) کا نام تو چراغ حسن حسرتؔ کے نام کے بھی بعد آرہا ہے۔ مفروضوں کی بنیاد پر کسی کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیقی امور میں اپنے موقف سے زیادہ حقائق محترم ہونا چاہئیں۔ سو اگر واقعی ہمت رائے شرما جی سے پہلے کسی ماہیا نگار نے اردو ماہیے کہے ہیں اور ان کا ٹھوس ثبوت مل جاتا ہے تو میں اسے تسلیم کرنے میں کبھی بھی نہیں ہچکچاؤں گا۔ لیکن کسی آدھی ادھوری تحقیق اور تعصب کی بنیاد پر اور غم وغصہ کے ساتھ کوئی اپنے فرمودات کو تحقیق کا نام دیتا ہے تو اسے کوئی بھی دانشمند قبول نہیں کر سکتا۔ زمانی لحاظ سے تو ہمت رائے شرما جی کو ابھی تک دوسرے تمام دعوے داروں پر فوقیت حاصل ہے تاہم یہاں اگر ''فرضِ محال'' کے طور پر حسرتؔ اور برقؔ صاحبان کی زمانی اولیت کو مان لیا جائے (جو حقیقتاً ہرگز ہرگز ثابت نہیں) تب بھی ہمت رائے شرما جی ہی اردو ماہیے کے بانی ہیں۔ اس لئے کہ خود ڈاکٹر مرزا حامد بیگ حسرتؔ اور برقؔ کے ''ماہیوں'' کو درست وزن میں نہیں مانتے۔ لہٰذا ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی خام تحقیق کے باوجود، درست وزن کے ماہیے کہنے میں اولیت تو ہمت رائے شرما جی کا ہی اعزاز رہتا ہے۔

کیا فرماتے ہیں علماءِ تحقیق بیچ اس مسئلہ کے؟

بہرحال اپنی تمام تر جوابی تلخی کے باوجود میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اپنے مضمون کے ذریعے مجھے متحرک کیا اور ماہیے کے منظر نامہ کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور دکھانے کا موقعہ عطا کیا۔ یہ ماہیے کی مقبولیت کا ایک اور ثبوت ہے کہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ جیسے دوست بھی اس طرف توجہ دینے لگے ہیں۔

(مطبوعہ جدید ادب جرمنی۔ شمارہ مئی ۲۰۰۰ء)

نوٹ: میں نے اس مضمون میں سے چند زیادہ سخت سطور حذف کر دی ہیں۔ (ح۔ق)

''نیرنگ خیال'' کا ماہیا نمبر

ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' راولپنڈی تاریخ ساز ادبی جریدہ ہے۔حکیم محمد یوسف حسن نے جولائی 1924ء میں لاہور سے اس کا اجراء کیا تھا۔اس کے ابتدائی لکھنے والوں میں علامہ اقبال،سر عبدالقادر، آغا حشر کاشمیری، نیاز فتح پوری، پریم چند، امتیاز علی تاج، محمود شیرانی، یگانہ چنگیزی، قاضی عبدالغفار، سیماب اکبرآبادی، ریاض خیرآبادی، اختر شیرانی اوراس دور کے اور کتنے ہی اہم لکھنے والے شامل تھے۔''نیرنگ خیال'' کے سالناموں کے ساتھ اس زمانے میں اس کے کئی اہم خصوصی نمبرز نکالے گئے۔ان نمبرز میں سب سے اہم ترین ''اقبال نمبر'' ہے جو آج بھی حوالے کی مستند دستاویز ہے۔1967ء میں حکیم محمد یوسف حسن اس رسالے کے مدیرِاعلیٰ بن گئے اور سلطان رشک اس کے مدیر مقرر ہوئے۔حکیم صاحب کی وفات کے بعد بھی سلطان رشک اس رسالہ کے مدیر ہیں۔اکتوبر 1999ء کا شمارہ ''نیرنگ خیال'' کا ماہیا نمبر ہے۔اس سے پہلے پاکستان سے پنجابی اخبار ''بھنگڑا'' گوجرانوالہ کا اردو ماہیا ایڈیشن اور دو ماہی ''گلبن'' احمد آباد کا ماہیا نمبر شائع ہو چکے ہیں۔''نیرنگ خیال'' کے اس ماہیا نمبر کی یہ تاریخی حیثیت بنتی ہے کہ یہ پاکستان سے کسی ادبی رسالے کا پہلا ماہیا نمبر ہے۔سلطان رشک نے اس نمبر کے لئے خاص طور پر معروف شاعر احمد حسین مجاہد اور نوجوان ادیب محمد وسیم انجم کو بطور مرتبین شامل کیا۔دونوں مرتبین نے ممکنہ حد تک خاصی محنت کی ہے اور اسے ایک یادگار نمبر بنا دیا ہے۔اداریہ اول سلطان رشک کا تحریر کردہ ہے جبکہ اداریہ دوم محمد وسیم انجم نے لکھا ہے۔ان اداریوں کے بعد جو مضامین شامل کئے گئے ہیں ان کی ترتیب یوں ہے۔

1- پنجابی لوک گیت ماہیے کی تحریری ہیئت از حیدر قریشی

2- اردو ماہیا، عروضی تناظر میں، از احمد حسین مجاہد

3- امین خیال ''یادوں کے سفینے میں'' از ناصر نظامی

4- ماہیے کی عروضی اشکال از عارف فرہاد

5- اردو ماہیے کی ہیئت از اختر رضا کیکوٹی

6- اردو ماہیے کو بساتے ہوئے شہر اور بستیاں، از حیدر قریشی

7- اردو ماہیے کی تاریخ میں سب سے پہلے از ارشد خالد

ان مضامین میں ایک طرف ماہیے کی لے کی بنیاد پر اس کے عروضی پیمانے واضح کرنے کی مخلصانہ کوششیں کی گئی ہیں تو دوسری طرف ماہیے کی ہیئت کے سلسلے میں اڑائی گئی ساری گرد کو صاف کیا گیا ہے۔یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ جب ماہیے کی لے کی بنیاد پر دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کی کمی والی بات پکی ثابت ہوگئی اور مساوی الوزن سہ مصرعی، ماہیئے کے لئے کوئی دلیل نظر نہ آئی تو یار لوگوں نے حسب سابق ماہیے کی سہ مصرعی اور ڈیڑھ مصرعی فارم کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔اس سلسلے میں سہ مصرعی فارم کو رد کرتے ہوئے ماہیے کے لئے ڈیڑھ مصرعی فارم کا حکم سنایا گیا۔ مخالفین نے خاصے مغلوب الغضب ہو کر غم و غصے کا اظہار کیا لیکن ان کے تیروں کا رخ صرف ہماری طرف رہا۔تین مساوی الوزن ''ماہیے'' لکھنے والوں کو کسی نے میلی نظر سے بھی نہیں دیکھا۔بعد میں پتہ چلا یہ شوشہ ہی ان لوگوں کے اشارے پر چھوڑا گیا تھا تا کہ ماہیے کی لوک لے کی بنیاد پر قائم ماہیے کے وزن میں نقب لگائی جا سکے۔بہر حال اس موضوع پر ''نیرنگ خیال'' کے ماہیا نمبر میں نہ صرف کھل کر یار لوگوں کے شور شرابے کو واضح کیا گیا ہے بلکہ اپنے اصولی موقف کو بھی واضح کر دیا ہے۔عروضی پیمانوں اور سہ مصرعی ہیئت کے مسئلوں سے ہٹ کر اور ان مباحث کو چھوڑ کر ماہیوں کی پرکھ کے سلسلے میں عملی تنقید کا آغاز بھی اس نمبر کے ذریعے ہوا ہے۔ماہیے کا یہ دور جس میں ماہیے کی تاریخ جنم لے رہی ہے، ایک مضمون کے ذریعے بعض تاریخی امور کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اس نمبر میں ایک سو ماہیا نگاروں کے ماہیے شامل کئے گئے ہیں۔یہ تعداد ''گلبن'' کے ماہیا نمبر کے ماہیا نگاروں کے لگ بھگ ہی ہے۔اس کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس میں پہلے سے

فعال ماہیا نگاروں کے علاوہ کئی خوش گو شعراء ماہیا نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں ۔ایسے شعراء میں ترنم ریاض، بشریٰ رحمٰن ، ڈاکٹر فراز حامدی، ہیرا نند سوز، کرشن کمار طور، آصف ثاقب، رستم نامی، بخش لائل پوری، ثروت محی الدین، جمشید مسرور، قاضی حسیب، ناصر نظامی اور بعض دیگر شعراء شامل ہیں۔ پہلے سے ماہیا نگاری میں متحرک شعراء میں سے امین خیال، احمد حسین مجاہد، ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی، نذیر فتح پوری، عارف فرہاد، سلطانہ مہر، ڈاکٹر صابر آفاقی ،سجاد مرزا، قاضی اعجاز محور، خاور اعجاز، شرون کمار ورما، یوسف اختر ، پروین کمار اشک، مسعود ہاشمی، سلیم انصاری، سعید شباب، عذرا اصغر، ثریا شہاب، شاہدہ ناز، ارشاد ہاشمی ، زہیر کنجاہی، جاوید خان، محمد وسیم انجم، اختر رضا کیکوٹی، کلیم شہزاد، انوار فیروز، اعزاز احمد آذر، فراغ روہوی، شبہ طراز، شوکت ہاشمی ، ہارون الرشید، منور احمد منور، تاج الدین تاج ، ذوالفقار احسن ، پرزرق صنم ،حسن عسکری کاظمی ، احمد رئیس، سلطان سکون، سلیم احمد سلیم ،شاہد جمیل ، عارف حسن خان، محمد ارباب بزمی ، نیاز احمد صوفی ، عاصی کاشمیری ، کامنی دیوی، صابرہ خاتون حنا، کوثر بلوچ، انور مینائی، شعراور ینوی، احمد کمال حشمی ، اقبال حمید، اشراق حمزہ پوری، تنویر خیال ، ایم این اے ریحان ، کے دوش بدوش ضمیر یوسف، شمیم انجم وارثی ، سلطان کھاروی ، دلدار ہاشمی ، منصور عمر، وسیم عالم ، یونس احمر، اسلم حنیف، محمد یعقوب فردوسی ، مشتاق احمد، نیاز بلوچ، یاسمین سحر ، بلال حمزہ پوری، ساحر شیوی، سرفراز تبسم، سہیل اقبال، طفیل خلش مخلص وجدانی ، واحد محسن ، بشارت احمد بشارت، اجمل پاشا، ارشد اقبال آرش اور احسان سہگل تک ماہیا نگاروں کی ایک دنیا آباد ہے۔سینئر اور بزرگ شعراء میں علامہ شارق جمال، علقمہ شبلی ، قیصر شمیم ، علامہ نادم بلخی ، اجمل جنڈیالوی ، امداد نظامی اور پربھا ماتھر کے اسماء شامل ہیں ۔ ماہیے کے پیشروؤں میں قتیل شفائی کے نئے ماہیے اور اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما جی کے تازہ ماہیے بھی اس نمبر کی زینت ہیں ۔اس نمبر سے اردو ماہیے کی تحریک ایک نئے موڑ تک آ گئی ہے ۔ایک تاریخی حیثیت کے حامل ادبی رسالے کا یہ ماہیا نمبر ایک تاریخی کارنامہ ہے جس کے لئے رسالہ کے مدیر اور مرتبین مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(مطبوعہ ماہنامہ ’’قرطاس‘‘ ناگپور ماہیا نمبر۔مئی تا اگست ۲۰۰۰ء)

ہمت رائے شرما جی کا ’ماہیا‘ اور وضاحت احوال

ہمت رائے شرما جی کے تئیں میرا رویہ سراسر محبت کا ہے ۔ جب وہ ماہیے کے بانی کی حیثیت سے دریافت ہوئے تب ان کے بانی قرار پانے میں ان کی اپنی بعض تحریروں کی وجہ سے اور بعض دوسرے احباب کی تحقیقی بددیانتی کی وجہ سے اور بعض احباب کی غلط فہمی کی وجہ سے بہت سے شبہات پیدا ہو گئے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ مجھے تحقیقی زاویئے سے وہ شبہات دور کر کے اصل حقائق کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی توفیق ملی ۔ ہمت رائے شرما جی نے ساڑھے سولہ سال کی عمر میں کسی رہنمائی کے بغیر پنجابی کے مطابق فلم ’’خاموشی‘‘ کے لئے اردو میں ماہیے لکھے تھے۔ اردو ماہیے کا بانی قرار پانے کے بعد میرا ان سے براہ راست رابطہ ہوا۔ان کے اپنے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی وقت انہیں اتنا بڑا اعزاز عطا کر دے گا چنانچہ اس خوشی میں انہوں نے اس عمر میں ماہیے کے سلسلے میں زیادہ سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا چاہا۔اسی خواہش کے نتیجہ میں انہوں نے ایک مضمون ’’ماہیا‘‘ تحریر کیا اور مجھے بھیجا۔میں نے ان کی دلجوئی کی خاطر ان کی تھوڑی سی تعریف کی لیکن ساتھ ہی انہیں لکھ دیا کہ اسے کہیں بھی نہ چھپوائیں ۔ دراصل اس مضمون میں شرما جی نے بعض بہت ہی بچگانہ سی باتیں کی تھیں۔ تحقیقی زاویئے سے تو اس سے پنجابی ماہیے کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑنا تھا لیکن اس سے خود شرما جی کی علمی سبکی ہونا تھی ۔اسی لئے میں نے انہیں اس مضمون کی اشاعت سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی ۔اس کے باوجود یہ مضمون ’’قرطاس‘‘ ناگپور اور ’’سفیر اردو‘‘ لیوٹن میں شائع ہو گیا ہے ۔میرے نزدیک اگر کسی نے اس مضمون کی اشاعت کیلئے شرما جی کو اکسایا ہے تو وہ ماہیے کی تحریک کا نادان دوست ہے اور اگر شرما جی نے خود ہی ایسا کر لیا ہے تو انہوں نے اپنے ساتھ زیادتی کی ہے۔ یہاں میں اس مضمون کے ایک بنیادی نکتہ پر بات کروں گا تاہم اس سے

پہلے شر ماجی کے تعلق سے اپنے پہلے سے لکھے ہوئے بعض الفاظ یہاں درج کرنا چاہتا ہوں تا کہ شر ماجی کے مضمون کی ''معصومیت'' کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔

☆''ہمت رائے شر ماجی کے جو خطوط ''کوہسار'' میں شائع ہوئے ہیں ان کی روشنی میں مزید تحقیق کر کے اصل حقیقت تک تو پہنچا جا سکتا ہے لیکن ان پر مکمل انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ ہمت رائے شر ماجی گذشتہ آٹھ برسوں سے لقوہ اور فالج کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ ویسے تو طویل عمر کے بعد پچاس ساٹھ سال پہلے کی باتیں پوری طرح یاد نہیں رہ پاتیں، ان کا تاثر سا باقی رہتا ہے جبکہ فالج تو ایسی بیماری ہے جو یادداشت کو متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فلم ''خاموشی'' کے ماہیے لکھنے کا سن کبھی 1937ء بتایا ہے، کبھی 1939ء اور کبھی اسے پچاس ساٹھ سال کے اندازے سے ظاہر کیا ہے۔ ان تاریخوں میں جو تضاد ہے اس کا سبب صرف بیماری کی وجہ سے یادداشت کا متاثر ہونا ہے۔'' (مضمون ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' مطبوعہ ''انشاء'' کلکتہ۔ ستمبر 1998ء)

☆''چونکہ شر ماجی کی یادداشت پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے میں تذبذب کی حالت میں رہا اور اپنے پہلے مضمون میں شر ماجی کا ایک خاص بیان شامل نہیں کیا، لیکن اب مئی 1936ء کا ثبوت مل جانے کے بعد پورے اعتماد کے ساتھ ان کا بیان شائع کر رہا ہوں'' (مضمون ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما، فلم خاموشی کے گیت اور تحقیق مزید'' مطبوعہ ''جدید ادب'' مئی 1999ء)

☆''وہ (شر ماجی) طویل عرصہ سے فالج کا شکار ہیں۔ بات کرتے کرتے کئی بار بات بھول جاتے ہیں۔ ذرا سی بات پر بچوں کی طرح بلکنے لگتے ہیں۔ ایسی حالت اور ایسی کیفیت کا حامل کوئی شخص ایسی کاریگری نہیں کر سکتا جو مرزا حامد بیگ نے ان سے منسوب کر دی ہے۔''

(مضمون ''مرزا صاحب کے جواب میں'' مطبوعہ ''جدید ادب'' جرمنی، مئی 2000ء)

یہ تینوں مضامین میں نے شر ماجی کی حمایت میں لکھے ہیں اور ان تینوں میں بھی اہمیت اصل حقائق کو دی ہے۔ محض شر ماجی کے بیان کو اہمیت دینے کی بجائے میں نے پہلے حقائق کی چھان بین کی ہے اور اس کے بعد ان کے کسی بیان کو قبول کیا ہے یا نظر انداز کر دیا ہے۔ اب جو شر ماجی نے مضمون لکھا ہے اس میں انہوں نے لفظ ''ماہی'' کی چرواہے کے معنی کی تردید کرتے ہوئے

اسے ''ماہ'' (چاند) سے ماہی قرار دیا ہے۔ اس سے نئی نکتہ آفرینی کی حد تک تو مزہ لیا جا سکتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے ڈاکٹر رفعت اختر نے اسے اردو کے لفظ ''ماہی'' (مچھلی) سے جوڑ دیا ہے۔ سو ان تک بندیوں کو معنوی قربت کے باعث نکتہ آفرینی کی حد تک قبول کیا جا سکتا ہے لیکن ماہیے کے سلسلے میں یہ بالکل واضح ہے کہ پنجابی میں اس کا مطلب ''چرواہا'' اور ''محبوب'' دونوں معنی میں مستعمل ہے۔

پنجاب کے نوجوان چرواہے جب بھینسیں چراتے تھے تو اس وقت اپنا ٹائم پاس کرنے کے لئے بانسری بجانے سے لے کر گنگنانے تک ایسے کام کرتے تھے کہ جانوروں پر بھی نظر رہے اور جی بھی بہلتا رہے۔ عام نوجوان چرواہے بھی کئی مٹیاروں کے دلوں کی دھڑکن بنے ہوں گے تاہم جب مہینوال اور رانجھے جیسے رومانوی کردار بھی چرواہے کے روپ میں سامنے آئے تو پھر یہ لفظ ''ماہی'' چرواہے سے زیادہ محبوب کے لئے مخصوص ہوتا گیا۔ پنجابی میں ماہیے کا رُوٹ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ماہیے پر بہت زیادہ کام کرنے والے پنجابی سکالروں میں پروفیسر شارب سے لے کر تنویر بخاری تک سب یہی موقف رکھتے ہیں اور یہ ان لوگوں کا موقف ہے جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ پنجابی ماہیے کی تحقیق اور دریافت پر صرف کیا ہے۔ شر ماجی اپنی ساری متحرک اور ادبی لحاظ سے فعال زندگی میں ماہیے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ پائے۔ اب اس علالت اور ذہنی ارتکاز قائم نہ رہنے کی حالت میں ان کی تحقیق کیونکر درست ہو سکتی ہے کہ انہوں نے ماہیے کی تحقیق کے سلسلے میں پنجابی سکالرز کو بالکل ہی نہیں پڑھا۔ یہاں پنجابی میں ''ماہی'' بمعنی چرواہا کے ثبوت کے طور پر وارث شاہ جیسے مستند اور کلاسک شاعر کے کلام سے چند مصرعے پیش کر رہا ہوں

ہیر اپنے والد کو کہتی ہے

''ماہی'' ڈھونڈ کے بابلا! اساں آندا
صفت ایسدی کہی نہ جاوندی اے

اس کا مطلب یوں ہے کہ ہیر کہتی ہے کہ والد صاحب! میں ایک ایسا ماہی (چرواہا)

ڈھونڈ کے لائی ہوں جس کی خوبیاں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ یہاں واضح طور پر ماہی بمعنی چرواہا آیا ہے۔اگر چرواہالانے کی بجائے صرف محبوب کے معنی میں اسے لیں تو اس کا مطلب یہ بنے گا کہ ہیرا اپنے والد سے کہہ رہی ہے کہ والد صاحب ! میں ایک ایسا محبوب ڈھونڈ کے لائی ہوں جس کی خوبیاں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ یہ مطلب قطعاً قصہ ہیر،رانجھا میں وارث شاہ نے بیان نہیں کیا اور وارث شاہ سے ایسی حماقت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چند مصارع اور بھی پیش کرتا ہوں، اس دعویٰ کے ساتھ کہ ان سب میں ''ماہی'' جمع اور واحد دونوں صیغوں میں چرواہا کے معنی میں آیا ہے۔

میری جان بابل جیویں ڈھول راجہ ''ماہی'' مہیں داڈھونڈ لیائی آں
جوہ وچ ''ماہی'' مجھیں چار دے سن رانجھے ہیرول کر دھیان میاں
بھکھا جا ''ماہی'' مہیں نال چھڑیا اسدے کھانے دی خبر نہ کسے لیتی
سارا پنڈ ڈرے اوس ماہیڑے توں سر ''ماہیا'' دے اوہدا کنڈ ڑاجے
وارث شاہ میاں جاویاہ داسی سنجے پھرن کھیندے منگو ''ماہیاں'' دے

یہ صرف وارث شاہ کے چند حوالے ہیں۔ وگرنہ دوسرے قدیم اور مستند پنجابی شعراء کے کلام سے بھی اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔سو میں ہمت رائے شرما جی کے مضمون کو ان کی ایک معصومانہ کاوش سمجھ کر نظر انداز کرتا ہوں۔انہوں نے سب سے پہلا ماہیا ظہیرالدین بابر سے منسوب کیا ہے۔ یہ بھی ابھی تک صرف ایک مذاق والی بات لگتی ہے۔اس لئے کہ خود شرما جی کے اپنے بیان میں تضاد ہے۔ پہلے لکھتے ہیں ''یہ ماہیا بابر کے بچپن کے دوست میر باقی خان نے گایا جو ترکی زبان میں تھا'' جبکہ چار سطروں کے بعد ہی یہ لکھتے ہیں ''جب میر باقی خان نے ہیرے جواہرات اور موتیوں سے بھرا ہوا تھال بابر کو پیش کیا تو قلندر صفت بادشاہ نے برجستہ کہا:

مج کونہ ہوا کچ ہوس مانک وموتی
فقر اہلیغر بس
بولغوسید ور پانی وروتی

یہ تھا سب سے پہلا ماہیا نما شعر جو بابر نے اپنی زبانی اور اس وقت بولی جانے والی پنجابی زبان میں

کہا تھا''۔

☆ چار سطر پہلے میر باقی خان نے ''پہلا ماہیا'' ترکی زبان میں گایا تھا اور چار سطروں کے بعد ہی لکھتے ہیں یہ ''ماہیا نما شعر'' بابر نے پنجابی میں کہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ سب کچھ صرف شرما جی کی علالت کا نتیجہ ہے تاہم ''توزک بابری'' سے اس سلسلے میں مزید تحقیق کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ مجھے اب بھی ہمت رائے شرما جی سے محبت ہے لیکن ان کے مضمون سے چونکہ بنیادی قسم کا مغالطہ پھیل سکتا ہے۔اس لئے میں اصل حقائق واضح کر کے اپنا فرض پورا کر رہا ہوں۔ ماہیے کے بانی آج بھی ہمت رائے شرما ہیں، اس کی تحقیق میں نہ ان کا کوئی سابق رول تھا نہ وہ اب بوجہ علالت ایسا کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''اردو دنیا'' جرمنی، اکتوبر 2000ء)

ماہیے کا جواز

سہ ماہی ''مژگاں'' کلکتہ کے شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء میں ''کھلی ادبی بحث'' کے تحت پرویز اختر کے جو تاثرات شائع ہوئے ہیں مجھے ان کے حوالے سے جواباً کچھ عرض کرنا ہے۔انہوں نے ماہیے کی اب تک کی بحث کا پورا مطالعہ کیا ہوتا تو ماہیے کے جواز کا سوال نہ اٹھاتے بلکہ اس سلسلے میں میری وضاحت سے بات آگے بڑھاتے۔دو ماہی ''گلبن'' احمد آباد کے ماہیا نمبر میں میرا مضمون ''ماہیے کی کہانی'' شائع ہوا تھا۔اس میں ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کے تین سوالات کے جواب بھی دیئے گئے تھے۔ان کا پہلا سوال ہی یہ تھا ''ماہیا سے پہلے اردو میں ہائیکو، ثلاثی اور بعض دیگر سہ مصرعی اصناف موجود ہیں۔ان کے ہوتے ہوئے ماہیا کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' اسی بات کو پرویز اختر نے اپنے تاثرات میں گھما پھرا کر دہرایا ہے۔سو اس کے جواب میں اپنے مضمون کا وہی حصہ یہاں دہرا دیتا ہوں جو دو سال پہلے ''گلبن'' کے ماہیا نمبر میں چھپ چکا ہے۔

''میرے خیال میں کسی ادبی صنف کا آغاز کبھی بھی کسی پلاننگ کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔غزل قصیدے سے الگ کیوں ہوئی؟ برّ ِصغیر میں داستانوں کی عظیم روایات کے ہوتے ہوئے ہمیں ناول اور افسانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ایسے سوال تو شاید ہر ادبی صنف کے بارے میں کئے جا سکتے ہیں جبکہ حقیقتاً ہر صنف خودرو پودوں کی طرح اپنی زمین اور اپنی زبان سے خود بخود اُگ آتی ہے۔جو تجربے دوسری زبانوں سے آتے ہیں وہ بھی جب تک نئی زبان اور کلچر کے اندر تک اتر کر اپنی جڑیں مضبوط نہ کر لیں تب تک برگ و بار نہیں لا سکتے۔اس لئے ماہیے کے بارے میں کسی ''نظریہء ضرورت'' کی تلاش مناسب نہیں ہے۔ہاں امکانات پر ضرور غور کیا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ بھی ایک امکانی بات ہے کہ ہائیکو اور ثلاثی کے تجربات اردو میں کسی سہ مصرعی صنف کی داخلی جستجو رہے ہوں لیکن ہائیکو اور ثلاثی ثقافتی سطح پر اردو میں جُڑ نہیں پا رہے ہوں، تب ماہیے نے چُپکے سے اپنے ادبی اور ثقافتی وجود کا اظہار کر دیا ہو۔ممکن ہے پنجابی اور اردو کی لسانی قربت اور برّ ِصغیر کے ایک بڑے علاقے میں اپنی ثقافتی جڑیں ہونے کے باعث ماہیا دوسری تمام سہ مصرعی اصناف کے مقابلے میں کہیں زیادہ زرخیز ثابت ہو''

پرویز اختر نے ایک طنزیہ فرما دیا ہے کہ ''محض موجد بننا۔۔۔!! یہ تخلیق کا زوال ہے نہ کہ کمال! کیا تخلیق کار کا مقصد یہ ہے کہ وہ محض موجد بن کر رہ جائے؟''

ماہیے کا موجد ہونے کا کسی کا بھی دعویٰ نہیں ہے۔اردو میں اس کا اوّلین نقش ہمت رائے شرما کے ہاں ملتا ہے اور ۱۹۳۶ء میں ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فلم ''خاموشی'' کیلئے لکھے جانے والے ان کے یہ ماہیے کبھی انہیں اردو ماہیے کا بانی بنا دیں گے۔ہاں جو لوگ بھی اس نئی صنف کے فروغ میں دلچسپی لے رہے ہیں اور حاسدوں، بدخواہوں کی مخالفانہ ملامت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، ان کی ماہیے کے لئے خدمات تو بہرحال ادب کی تاریخ میں رہیں گی۔

موصوف کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ ثلاثی میں جو بات کہی جا سکتی ہے اسے ماہیے میں کیوں کہا جائے اور کبھی اس بات پر برہم ہونے لگتے ہیں کہ جب بات غزل کے دو مصرعوں میں مکمل ہو سکتی ہے تو تین مصرعوں کی کیا ضرورت ہے؟ (تین مصرعوں کا اعتراض بھی صرف ماہیے پر ہے۔ثلاثی یا ہائیکو یا کسی اور سہ مصرعی صنف پر نہیں ہے۔)

یہاں پھر اپنی ۱۹۹۳ء کی ایک تحریر دہرا دیتا ہوں تاکہ یہ بھی واضح ہو سکے کہ یا تو ہمارے معترضین کا مطالعہ کچا پکا اور ادھورا ہے اور یا وہ جان بوجھ کر ایک وقفہ کے بعد پرانے اعتراض دہرانے لگے ہیں۔موصوف صرف غزل کے حوالے سے اعتراض کر رہے ہیں میں نے غزل سمیت نظم اور گیت کے حوالے سے بات کی تھی۔

''اردو شاعری کی تین بڑی روایات گیت، غزل اور نظم مجھے ماہیے میں یکجا ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔ماہیا بنیادی طور پر ایک چھوٹی سی نظم ہے لیکن اس میں تین مصرعوں کے باوجود پہلے اور

آخری مصارع میں قافیہ، ردیف کا التزام اسے غزل کے شعر کے قریب کر دیتا ہے۔ پھر کوزے میں دریا بند کرنے کا غزل کے شعر کا وصف بھی ماہیے میں موجود ہے۔ مزاجاً ماہیا گیت جیسا ہے۔۔۔۔لہٰذا اگر اس صنف کو پھلنے پھولنے کا موقعہ ملا تو اس کے وسیع تر امکانات کھل کر سامنے آئیں گے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بنیادی اینٹ درست رکھی جائے۔''

(بحوالہ ''اوراق'' لاہور شمارہ: نومبر، دسمبر ۱۹۹۳ء)

پرویز اختر نے لکھا ہے: ''اب تک ماہیہ کے نام پر جو دستیاب ہوا ہے، اس کی روشنی میں ماہیہ کے علمبرداروں اور اس کے تئیں نرم گوشہ رکھنے والے ادب نوازوں سے یہ سوال ضرور کرنا چاہوں گا کہ کیا وہ ادب اور اس سے جڑی ہوئی صنف کی اہمیت و افادیت اور قوت سے واقف ہیں؟ کیا وہ واقعی اس صنف سے پوری طرح انصاف کر پا رہے ہیں؟''

چونکہ میں بھی اس صنف کے لئے نرم گوشہ رکھتا ہوں اس لئے اس سوال کا رُخ اپنی جانب بھی سمجھتا ہوں۔ میں اس صنف کے حوالے سے اتنی واقفیت تو رکھتا ہی ہوں کہ پرویز اختر صاحب جو سوال اس صدی میں اُٹھا رہے ہیں ان کے جواب میں گزشتہ صدی میں دے چکا ہوں۔

رہی انصاف کرنے بات، تو صاحب! یہ بتایئے ادب کی دوسری اصناف کے ساتھ کتنا انصاف ہو رہا ہے؟ وہاں بھی بیک وقت اچھا بھی لکھا جا رہا ہے اور برا بھی لکھا جا رہا ہے۔ بے وزن غزلیں بھی لکھی جا رہی ہیں لیکن اس غلطی کا الزام غزل کے سر تو نہیں تھوپا جا سکتا۔ ایسے ہی اگر بعض لوگ کمزور ماہیے کہہ رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ماہیے کی صنف کو ہی برا کہہ دیا جائے۔ مجھے علم نہیں ہے کہ میں کسی بھی ادبی صنف کے ساتھ انصاف کر پا رہا ہوں یا نہیں، تاہم یہاں اپنے چند ماہیے پیش کئے دیتا ہوں۔

رائن سے چناب ملا
کوئی حقیقت تھی
یا خواب سے خواب ملا

یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
مغرب کی اذان ہوئی

جب 'عصر' اشارہ ہوا
سود میں ڈھلنے لگا
جتنا بھی خسارہ ہوا

(رائن جرمنی کا مشہور دریا ہے)

اک روح تھی سیلانی
چھوڑ کے شہرِ دل
جو ہو گئی ملتانی

اک یاد تھی بستے میں
کھو گئی جانے کہاں
اس عمر کے رستے میں

بچپن کے خزانے میں
کتنے زمانے تھے
اُس ایک زمانے میں

یہ بھید نہ کھل پائے
دل بھر آنے پر
کیوں آنکھ بھی بھر آئے

نہیں، ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

اس درد خزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ
رب کے شکرانے کے

الجھن سے چھڑاتے ہوئے
باندھ لیا دل کو
بال اس نے بناتے ہوئے

تھے دیس میں پردیسی
آ کے ولایت میں
اب ہو گئے ہیں دیسی

خوش قسمتی کا مارا
دل کلہم کلا
اور کثرتِ نظّارا

پھولوں کو پرونے میں
سوئی تو چُبھنی تھی
اس ہار کے ہونے میں

منظر ترے گاؤں کے
گرم دو پہروں میں
ہنستی ہوئی چھاؤں کے

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چُھوٹ گئے

تو کس کا سوالی تھا
دامنِ دل جس کا
خود اپنا ہی خالی تھا

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں
گوری کی سگائی پر

پھرتے ہیں اکیلے میں
ساتھ نہیں کوئی
صدمات کے میلے میں

مل مہکی فضاؤں سے
یار نکل باہر
اندر کے خلاؤں سے

مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہوولیوں کی

جھک آئے فلک سائیں
دیکھی تھی ہم نے
بس ایک جھلک سائیں

سب صبحوں کا تاج ہوئی
کثرت کی زبانی ہیں

رحمتِ عالمؐ کو
کعبہ کی دیواریں

جس شب معراج ہوئی
وحدت کی نشانی ہیں

کیا ان ماہیوں سے ماہیے کے آئندہ امکانات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا؟ اس بارے میں اب پرویز اختر خود انصاف کریں یا قارئین ادب انصاف کریں۔ مجھے اس برس کا ''گلبن'' کا غزل نمبر مرتّب کرنے کا موقعہ ملا تھا تو غزل کے ابتدائی دور کی غزلیں دیکھ کر مجھے جہاں غزل کے ارتقا کو سمجھنے میں آسانی ہوئی وہیں ذاتی طور پر مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ غزل کے مقابلہ میں ماہیے کو اپنے امکانات اجاگر کرنے میں زیادہ بہتر زبان اور فضا نصیب ہوئی ہے۔اس لحاظ سے اس کے پنپنے کے اور ادب میں اپنی مستقل حیثیت بنانے کے اچھے مواقع موجود ہیں۔اس لئے اس کے تئیں جارحانہ اور متعصّبانہ رویہ اپنانے کی بجائے ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔کوتاہیوں اور غلطیوں کی نشاندہی ضرور کریں لیکن ماہیے کی خیر خواہی اور بہتری کے جذبے کے ساتھ۔
یہی صحت مند رویہ ہے!

(مطبوعہ سہ ماہی ''مژگاں''،کلکتہ۔جولائی تا دسمبر ۲۰۰۰ء)

ماہیے کے خدوخال

عارف فرہاد راولپنڈی کے نوجوان اور فعال شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ماہیے کی تحقیق وتنقید کے سلسلہ میں بہت سے ضروری حوالہ جات کی فراہمی سے لے کر دیگر معاون امور تک راولپنڈی سے مجھے اختر رضا سلیمی اور ڈاکٹر وسیم انجم کی طرف سے بہت سپورٹ ملتی رہی تھی۔ ان کی اس تائید اور مدد کے لیے آج بھی تہہ دل سے دونوں دوستوں کا شکر گزار ہوں۔لیکن عارف فرہاد کی جانب سے میرا جو ساتھ دیا گیا وہ تخلیقی،تنقیدی اور تحقیقی تینوں زاویوں سے اتنا زیادہ اور اتنا اہم ہے کہ اس کے لیے شکریہ کا لفظ اپنے تمام تر اخلاص کے باوجود رسمی سا لفظ بن جائے گا۔

بحث کے عروج کے زمانہ میں عارف فرہاد نے دیوانہ وار کام کیا۔تخلیقی سطح پر مسلسل عمدہ ماہیے کہے۔تنقیدی مباحث کو نہ صرف غور سے دیکھا اور ان میں شرکت کی بلکہ مجھے مناسب مشورے بھی دیتے رہے۔اپنے طور پر کام بھی کرتے رہے۔ہمت رائے شرما جی کی زمانی اولیت کے مسئلہ پر بہت سارے دوسرے شواہد جمع ہو گئے تھے لیکن عارف فرہاد نے لاہور جا کر وہاں سے ایسا حوالہ تلاش کیا جو اس بحث میں ایک طرح سے فیصلہ کن کردار ادا کر گیا۔احمد سعید ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری،ایم اے او کالج لاہور کی کتاب 'مسلم انڈیینز آف بائیوگرافیکل ڈکشنری' کے صفحہ نمبر ۳۲۷ کا حوالہ سامنے لانا حقیقتاً عارف فرہاد کی محنت تھی جس نے مجھے اپنے تحقیقی کام میں بہت تقویت دی۔اس حوالے کے سلسلہ میں میرا مضمون ''مرزا صاحب کے جواب میں'' دیکھا جا سکتا ہے۔یہاں صرف یہ کہنا مقصود تھا کہ عارف فرہاد نے خلوصِ دل اور سچی لگن کے ساتھ اس علمی و ادبی معاملہ میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

اُس زمانہ میں ہمارے ایک مخالف کرم فرما نے اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر وسیم انجم کے تعلیمی سلسلہ کو مشکل میں ڈالنے کی کوشش کی تھی۔عارف فرہاد کا پی ایچ ڈی

کا پراجیکٹ تو بطور خاص شروع ہونے سے پہلے ہی ان کرم فرما کی زد میں آ گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ عارف فرہاد کا پی ایچ ڈی کرنا کھٹائی میں پڑ گیا ہے تو دلی افسوس ہوا۔ ابھی تک یہ سب کچھ حسابِ دوستاں دردل والا معاملہ تھا لیکن اب عارف فرہاد کی تحقیق وتنقید کی کتاب ''ماہیے کے خدو خال'' پر لکھنے بیٹھا ہوں تو مجھے یہ ساری باتیں یاد آتی گئی ہیں۔ اور ایمانداری کے ساتھ اپنی دلی کیفیت کو بیان کرتا گیا ہوں۔

''اردو ماہیے کے خدوخال'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ تب تک تحقیق وتنقید کے حوالے سے ماہیے پر میری تین کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ دوسرے بہت سارے دوستوں نے ماہیے کی بحث کے مختلف پہلوؤں پر عمدہ مضامین لکھے تھے، ان میں سے بعض سطحی نوعیت کے اور غیر ضروری بھی تھے لیکن بہت سارے معیاری اور علمی بحث کو آگے بڑھانے والے تھے۔ تاہم ایسا سارا کام بکھری ہوئی صورت میں تھا۔ عارف فرہاد کی کتاب ''اردو ماہیے کے خدوخال'' اس لحاظ سے کسی دوست کی پہلی کتاب تھی جس میں نہ صرف ماہیے کے خدوخال کو اجاگر کیا گیا بلکہ اس سلسلہ میں ہونے والی تب تک کی ساری بکھری ہوئی بحث کو یکجا کر دیا گیا۔

''چند اہم باتیں'' کے زیرِ عنوان کتاب کا ابتدائیہ تحریر کر کے عارف فرہاد نے سلیقے کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا ہے۔ اس کے بعد کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں ماہیا اور اس کی ابتدا، ماہیے کا مزاج، ماہیے کی عروضی اشکال اور ماہیے کی تقطیع کے عروضی قواعد کے عناوین کے تحت عارف فرہاد نے اپنے موقف کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ باب دوم میں ''ماہنامہ اوراق میں ماہیے کے فروغ پر ہونے والی ارتقائی بحث'' اور'' ماہنامہ اوراق میں شائع ہونے والے ماہیے'' کے تحت تفصیل درج کی گئی ہے۔ یہاں عارف فرہاد نے کج بحثی کرنے والوں کو نہ صرف اچھی طرح علمی گرفت میں لیا ہے بلکہ ماہیے کے خدوخال کو عمدہ طریقے سے مزید واضح کر دیا ہے۔

باب سوم میں ''ماہیے کے حوالے سے چند اہم خطوط'' کے زیرِ عنوان احمد ندیم قاسمی کا ایک خط اور میرے ۱۹ خطوط کو شامل کیا ہے۔ اپنے ان سارے خطوط کو پڑھتے ہوئے مجھے وہ زمانہ ایک بار پھر یاد آ گیا جب ماہیے کی بحث میں مجھے اور میرے دوستوں کو کئی اطراف سے الجھایا جا رہا تھا۔ تب ہی میں نے اپنی کتاب ''ماہیا۔۔۔علمی بحث سے غوغائے رقیباں تک'' ترتیب دینا

شروع کر دی تھی کیونکہ دوسرے فریق نے محض طاقت کے بل پر ہر طرح کا جھوٹ پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ تب میں ''۔۔۔غوغائے رقیباں'' والی کتاب کے لیے ایسی ساری کاروائیوں کی روداد پورے شواہد کے ساتھ جمع کر رہا تھا۔ میرے ۱۹ خطوط میں سے مکتوب نمبر ۱۵ محررہ ۱۴ رمئی ۱۹۹۸ء میں ایک خامی راہ پا گئی ہے۔ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۳۱ پر یہ جملہ درج ہے ''احمدیوں سے میرا یہاں مکمل سوشل بائیکاٹ ہے''۔ میں سوفی صد یقین کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ میری کسی تحریر میں ایسا لکھا ہوا نہیں ملے گا۔ میری دانست میں یہ جملہ یوں ہوگا:

''احمدیوں کی طرف سے میرا یہاں مکمل سوشل بائیکاٹ ہے''۔

ہو سکتا ہے۔۔'' کی طرف'' کے الفاظ کتابت ہونے سے رہ گئے ہوں۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ کسی کے ساتھ محض اس سے اختلافِ عقیدہ کے باعث نفرت کرنا یا اس کا سوشل بائیکاٹ کرنا میری فطرت کے خلاف ہے۔ میرے ہم مسلک ہوں یا غیر مسلک کے لوگ ہوں جو بھی اختلافِ عقیدہ کی بنا پر کسی کا سوشل بائیکاٹ کرتا ہے، درحقیقت اپنی علمی شکست کا اعتراف کرتا ہے۔ یہ اصول کسی ایک کے لیے نہیں ہر ایک کے لیے ہے۔

ایک گمان یہ بھی ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں بشیر سیفی نے علمی طور پر لاجواب بلکہ شرمندہ ہونے کے بعد آخری حربہ کے طور پر اپنے کسی شاگرد یا مسعود اختر کے فرضی نام سے ایک مضمون چھپوایا تھا کہ ماہیے کی یہ بحث کافروں کی سازش ہے۔ اس لیے عارف فرہاد نے مقامی طور پر اس کے ردِ عمل سے بچنے کے لیے میرے خط کو اس رنگ میں چھاپ دیا ہو، تاکہ مخالفت کا اثر زائل کیا جا سکے۔ مسعود اختر نامی کسی فرد کے اس الزام کے جواب میں تب ہی میں نے اپنا جواب بہ عنوان ''جوابِ آں غزل'' نوائے وقت راولپنڈی کے ادبی صفحہ پر چھپوایا تھا اور میرے جواب سے بھی زیادہ شاندار جواب اختر رضا سلیمی نے اپنے اخبار ہوٹل ٹائمز میں خود لکھ کر شائع کیا تھا۔ (یہ میٹر بھی میں نے ''۔۔۔غوغائے رقیباں'' والی کتاب میں سنبھال لیا تھا۔)

یہ ساری وضاحت اس لیے کرنا پڑی کہ میری نسبت کبھی بھی ایسا گمان نہیں کیا جانا چاہیے کہ میں کسی سے اختلافِ عقیدہ کی بنا پر نفرت کرتا ہوں اور پھر اس میں اس حد تک جا سکتا ہوں کہ نعوذ باللہ دوسروں کا سوشل بائیکاٹ کر سکتا ہوں۔ میں تو خود زندگی بھر اپنوں اور پرایوں سب

کی ایسی نفرتوں کا شکار رہا ہوں۔ میں ایسے اقدام کا مرتکب کیسے ہوسکتا ہوں۔

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہمیں معلوم ہے افسانۂ گل

باقی ادبی مباحث میں کسی کے مذہبی عقائد سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ دلیل کا جواب دلیل سے دیا جانا چاہیے، جھوٹے اور اشتعال انگیز بیانات سے نہیں۔ بہر حال تب سے اب تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ لیکن ان باتوں کا ماہیے کی بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عارف فرہاد نے اپنی کتاب ''اردو ماہیے کے خدو خال'' کے باب چہارم میں تین ماہیا نگاروں کی ماہیا نگاری کا خصوصی مطالعہ پیش کیا ہے۔ حیدر قریشی، زُہیر کنجاہی اور مسعود ہاشمی۔ اس سلسلہ میں بعض نسبتاً زیادہ بہتر ماہیا نگاروں کو بھی اس خصوصی مطالعہ میں شامل کر لیا جاتا تو یہ باب زیادہ اچھا ہو جاتا۔ محض مذکورہ تین ناموں سے خصوصی مطالعہ کا حق ادا نہیں ہوا۔

کتاب کے باب پنجم میں عارف فرہاد نے ماہیے کا ایک اچھا انتخاب پیش کیا ہے۔ اس میں ۱۵۵ کے لگ بھگ ماہیا نگاروں کے ماہیوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔

میرے لیے تو ماہیے کی بحث میں علمی و ادبی محبت کے ساتھ شریک ہونا ہی بہت بڑا ساتھ تھا، عارف فرہاد نے نہ صرف بحث میں بھر پور شرکت کی، بلکہ اس بحث میں میرے لکھے کو عزت دی اور اس سب کچھ کے ساتھ کتاب کا انتساب بھی بڑی محبت کے ساتھ میرے نام کر دیا۔

اردو ماہیا کی تحقیق و تنقید کے سلسلہ میں عارف فرہاد کی کتاب ''اردو ماہیے کے خدو خال'' ابتدائی قابلِ ذکر، اہم اور بنیادی کتابوں میں شامل رہے گی۔

عارف فرہاد کو ان کی اس محنت پر داد اور مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

(اپنی اس کتاب ''اردو ماہیا تحقیق و تنقید'' میں ''اردو ماہیے کے خدو خال'' پر میرے تاثرات

شامل نہ ہوتے تو مجھے اپنی کتاب ادھوری محسوس ہوتی۔ Reha Klinik میں قیام کے دوران عارف فرہاد کی کتاب پر آج ۲۵ رجولائی ۲۰۱۰ء کو کلینک کے اپنے روم نمبر ۴۱۲ میں یہ مختصر سے تاثرات لکھ کر اپنی اس کتاب کو مکمل کر لیا ہے۔)

نوٹ: برادرم اختر رضا سلیمی پہلے اپنے گاؤں کی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ کیکوٹی لکھا کرتے تھے۔ اب اپنے نام کے ساتھ سلیمی لکھتے ہیں۔ سو مضامین میں جہاں کہیں کیکوٹی یا سلیمی کا فرق ملے تو اس سے مراد بہر حال آپ ہی ہیں۔

ح۔ق

ماہیے پر مکالمہ

(لوک گیت سے ادبی صنف تک)

پلوشہ مومند (پشاور) / حیدر قریشی (جرمنی)

سلام حیدر صاحب!

سب سے اول تو معذرت قبول کیجئے، میری گزشتہ میل آپ کے لئے زحمت کا باعث ہوئی تھی۔اس پہ میں شرمندہ ہوں۔اردو ادب کے بارے میں بات کرتے ہوئے مجھے یقیناً اردو میں ہی بات کرنی چاہئے تھی۔اس میل میں میں نے جو بات کی تھی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

ا۔گو ماہیے کی تیکنیکی باریکیوں سے میں واقف نہیں لیکن اس کے بارے میں میرا گمان یہ ہے لوک ادب کی ایک صنف ہے اور لوک ادب میرے مشاہدے کے مطابق ہر معاشرے میں ہم عصر ادب سے الگ حیثیت رکھتا ہے۔لوک ادب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا مصنف ہونے کا دعویٰ کوئی نہیں کرتا بلکہ جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے اسے ساری کمیونٹی کا مشترکہ اثاثہ اور مشترکہ میراث سمجھا جاتا ہے۔اس ضمن میں، میں نے پشتو کی لوک شاعری کی اصناف کی مثالیں دیں تھیں کہ ان میں شاعری ہوتو رہی ہے لیکن ان کی آتھرشپ کلیم نہیں کی جاتی۔کیونکہ یہی لوک لٹریچر کی اصل سپرٹ ہے۔

۲۔اردو ادب میں لوک شاعری کی کوئی روایت موجود نہیں،اس لئے اردو شاعری میں ایک صنف کی حیثیت سے ماہیے کا تعارف کچھ آرٹیفیشل سی بات لگتی ہے۔

۳۔ماہیا شاید پنجابی لوک شاعری کی صنف ہے اس لئے اس کی خوبصورتی اور نزاکتوں کا احساس وہی لوگ زیادہ کر سکتے ہیں جن کی مادری زبان پنجابی ہے۔ایک پختون کی حیثیت میں ،میں ان لوگوں کے احساسات کا احترام تو کر سکتی ہوں لیکن ماہیے کے ساتھ وہ وابستگی محسوس نہیں کر سکتی جو ان کو ہے۔آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔اللہ حافظ

پلوشہ

28/ستمبر ۲۰۰۳ء

پلوشہ بی بی

سلام مسنون

آپ کی رومن اردو میں لکھی ای میل ملی۔شکریہ

ا۔آپ کی بات اصولاً درست ہے کہ لوک گیت پورے معاشرے کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں اور ان پر کسی کی انفرادی تصنیف کا لیبل نہیں ہوتا۔یہ بھی درست ہے کہ لوک گیت اپنے معاشرے کے مزاج کے عکاس اور ترجمان ہوتے ہیں۔تاہم کسی لوک سرمائے کا تدریجی سفر کرتے ہوئے لوک روایت سے ادبی روایت میں ڈھلنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔اس کے لئے متعدد مثالیں مل سکتی ہیں۔اس وقت جو مثالیں بالکل سامنے ہیں ان میں سب سے پہلے ہندی دوہا کو لے لیجئے۔یہ ہندی کا لوک گیت تھا۔اس کی غنائیت کے جادو نے ممتاز شعراء کو اپنا اسیر بنایا تو دوہا ادبی صنف کے طور پر لکھا جانے لگا۔ہندی سے یہ اردو میں بھی آیا۔اگرچہ اردو میں بعض دوستوں نے کچھ بے خبری کے باعث اور کچھ بسرام پر گرفت کی مہارت نہ ہو پانے کے باعث ہم وزن اشعار کو (یا دوپدوں کو) دوہے کے نام سے لکھا ہے تاہم اس میں شک نہیں کہ ہندی کا یہ لوک گیت اردو میں اپنے اصل چھندوں کے مطابق بہت خوبصورتی سے لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔یہ برصغیر کے اندر کی بالکل سامنے کی مثال ہے کہ لوک گیت ادبی صنف بن گیا ہے۔بلکہ ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ برصغیر کے ہندی گیت بھی تو اصلاً لوک گیت ہی تھے۔صدیوں پہلے یہ صرف

گائی جانے والی لوک شاعری تھی اوراس کے شعراء کا کوئی تعین نہ تھا۔آریائی اور دراوڑی تہذیبوں
کے ٹکراؤاور ملاپ سے جنم لینے والی یہ لوک شاعری برصغیر کی شاعری کی ابتداتھی۔ پھراسی بے نام
حوالے سے نام والے حوالے سامنے آنے لگے۔ ہندی اور اردو گیت نگاروں کی ایک طویل
فہرست بنائی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ماہیا جو پنجاب کی لوک شاعری تھی ایک عرصہ تک گایا جاتا
رہا۔فلمی شاعری نے آکر جب اس لوک گیت سے استفادہ کیا تو ایک طرح سے لوک شاعری اور
ادب کے درمیان رابطے کا کام کردیا۔ایسا کسی ادبی منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہوا۔

۱۹۳۶ء میں ساڑھے سولہ سال کے ایک لڑکے(ہمت رائے شرما) نے اپنے شہرامرتسر
کے ایک ناکام عاشق کے پنجابی ماہیے گانے سے متاثر ہوکرفلم خاموشی کے لئے اردو میں اسی طرز کو
استعمال کرتے ہوئے ماہیے لکھ دیئے۔ پھرایک لمبے وقفہ کے بعدقمر جلال آبادی،ساحرلدھیانوی
اورقتیل شفائی نے بھی اردو فلمی گیتوں میں جان ڈالنے کے لئے ماہیے سے استفادہ کیا۔فلم سے
ہٹ کراردوادب میں اس کے تجربے وقفے وقفے سے ہوئے ۔اور دوہے کی طرح یہاں بھی یار
لوگوں نے لوک روایت پرغور کئے بغیراسے برابرمصرعوں میں بانٹ کر''ماہیوں'' کے ڈھیرلگانے
شروع کردیئے۔ میں نے اورمیرے دوستوں نے صرف یہ اصرارکیاہے کہ اگر یہ لوک شاعری اردو
میں جڑیں پکڑ رہی ہے تو اس کی لوک روایت کو برقرار رکھنا چاہئے۔ یہاں ایک اور وضاحت بھی
کرتا چلوں کہ اردو کے ساتھ ساتھ بہت سے شعراءکرام ایک عرصہ سے پنجابی میں ماہیے کہہ رہے
ہیں۔پنجابی کے ادبی رسالوں میں ایسے شعرا کے ماہیے میں اپنے بچپن سے پڑھتا آرہا ہوں۔

۲۔بے شک اپنی محدودعمر کے حساب سے اردو زبان کی اپنی لوک روایت نہیں ہے،لیکن
اردو زبان نے جن زبانوں کی آمیزش سے جنم لیاہےان کی لوک روایات پربھی اس کا اتنا ہی حق بنتا
ہے جتنا ان کی لفظیات پرحق بن چکا ہے۔ جب عربی اور فارسی سے غزل،اور دوسری شعری
اصناف لی جاسکتی ہیں،ہندی سے دوہااور ہندی گیت لئے جاسکتے ہیں تو اس لحاظ سے پنجابی سے
اردو نے جتنا لسانی استفادہ کیا ہے اس کے عین مطابق ماہیے سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔کیا
خیال ہے؟

۳۔بے شک ماہیے کے مزاج کو پنجابی حضرات زیادہ بہتر طور پرپیش کر سکتے ہیں لیکن جب
کوئی ادبی تجربہ آگے بڑھتا ہے تو اپنی روایت میں رہتے ہوئے اس میں بہت سے نئے تجربات
بھی ہوتے ہیں۔ان تجربات میں کہیں کچھ''غلط سا'' بھی سرزد ہوسکتا ہے لیکن مجموعی طور پراگراس
کے اثرات ادب کے لئے مفید ثابت ہوں تو پھراس کی ادبی حیثیت خودبخود مستحکم ہوتی جائے
گی۔میں نے اپنے بعض مضامین میں مثالیں دے کر بتایا ہے کہ پنجاب کے بعض شعراء اپنے زعمِ
پنجابیت میں کیسے کیسے کمزوراور بے رس ماہیے کہہ رہے ہیں اوران کے مقابلہ میں مہاراشٹر، بنگال،
راجستھان اور بہار کے صوبوں کے شعراء کے ماہیوں میں ماہیے کا بنیادی مزاج نسبتاً زیادہ عمدگی
سے آگیا ہے۔یہ سارے حوالے میرے مضامین میں چھپ چکے ہیں۔آپ دیکھیں کہ ۱۹۹۲ء
سے اب تک بمشکل گیارہ سال کے عرصہ میں اردو ماہیا کو تین سو شعراء نے تخلیقی طور پر آزمایا
ہے۔یہ کوئی معمولی پیش رفت نہیں ہے۔ایسا محض پروپیگنڈے کے زور پرنہیں ہوتا بلکہ کسی زبان
میں کسی صنف کی داخلی طلب ہی اس حد تک لاتی ہے۔میرا خیال ہے کہ مختصر شعری اصناف کے
جتنے نئے تجربے گزشتہ پچاس سال کے دوران اردو میں ہوئے ہیں،اردو ماہیااپنی متعدد خصوصیات
کی بنا پران سارے تجربوں میں سب سے کم عمر ہوکربھی سب سے زیادہ مقبول ہوا ہے۔پنجابی
ماہیے کی جس خوبصورتی اورنزاکت کا آپ نے حوالہ دیا ہے،میرے مضمون''ماہیے کا جواز'' میں
شامل میرے ماہیوں کو اسی زاویے سے پڑھئے۔۔۔خدا کرے انہیں پڑھ کرآپ کا دل پسیج
جائے۔

بہرحال آپ کے خط نے مجھے لوک اصناف اورادبی اصناف کے درمیان فرق کے حوالے
سے اوران میں باہمی تعلق کے حوالے سے سوچنے کا موقعہ دیا ہے۔ابھی تک کی سوچ یہاں تک
لائی ہے۔میں اب غزل کے عربی دور کی بھی کچھ معلومات حاصل کرتا ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ
عربی غزل ایک زمانے میں'اورل' رہی ہے۔زبانی کلامی بولیں تو لوک کے قریب ہو جاتے ہیں
لیکن خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔فی الوقت آپ کے سوال کے تین پہلوؤں کے حوالے سے اپنے
خیالات کا اظہار کردیا ہے۔اب مزے کی بات تب ہے کہ آپ ماہیے کہنا شروع کردیں۔ریحانہ

صاحبہ کا شکریہ مجھ پر دہرے طور پر واجب ہو گیا ہے۔۔ایک تو اس لئے کہ انہوں نے ''جدید ادب'' کی اشاعت کے خواب کو سچ کر دکھایا اور دوسرے اب اس لئے کہ ان کے توسط سے آپ کے ذریعے ماہیے کی بحث میں ایک سنجیدہ اور علمی نکتہ سامنے آیا اور مجھے اس پر غور کرنے کا نہ صرف موقعہ ملا بلکہ مزید تحقیق کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ چونکہ وہ میرے شکریہ کہنے پر مائنڈ کرتی ہیں سو ان کا بھی شکریہ اور آپ کا بھی شکریہ، دونوں شکریے آپ کو پہنچیں۔ اللہ آپ دونوں کو خوش رکھے۔

والسلام نیک تمناؤں کے ساتھ

حیدر قریشی

۲۸ر ستمبر ۲۰۰۳ء

سلام حیدر صاحب آپ فوک اور نان فوک لٹریچر کے باہمی تعلق کے بارے میں تحقیق شروع کر کے یقیناً ایک بڑا کام کریں گے۔ میری طرف سے اس سلسلے میں پیشگی شکریہ قبول کیجئے۔ آپ کے خط میں ایک دو جملے ایسے تھے جن سے مجھے گمان گزرا کہ گویا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ماہیے کی صنفی حیثیت سے مجھے اختلاف ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ میں صرف یہ نہیں سمجھ پا رہی کہ فوک لٹریچر کی ایک genre نان فوک contemporary لٹریچر میں authership claims کے ساتھ کس طرح شامل ہو سکتی ہے۔ آپ نے ہندی دوہے اور فلموں میں پنجابی ماہیے سے استفادے کی بات لکھی ہے۔ میرے ذہن میں اس سے یہ سوال اٹھے ہیں۔

۱۔ لفظیات اور صوتیات کے حوالے سے اردو ہندی سے زیادہ قربت رکھتی ہے یا پنجابی سے؟

۲۔ اصناف سخن میں اپنی ساخت کے حوالے سے غزل، اور اقسام کے تنوع کے اعتبار سے نظم کو جو حیثیت حاصل ہے اس کو دیکھتے ہوئے لوک شاعری کی primitive قسم کی اصناف کا contemporary literature میں متعارف کروانا کس حد تک درست ہے؟ ''ماہیے کے جواز'' میں

آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ کسی بھی ادبی صنف کا آغاز کسی پلاننگ کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس سے مجھے صد فیصد اتفاق ہے۔ لیکن یہ معاملہ کسی نئی صنف کے آغاز کا نہیں بلکہ ادب کی ایک قسم کی صنف کو ادب کی دوسری قسم میں بطور صنف متعارف کرانے کا ہے۔ قصیدے سے غزل کے الگ ہونے اور داستانوں کی روایت کی موجودگی میں ناول اور افسانوں کے لکھے جانے کی مثال آپ نے دی ہے۔ اس سلسلے میں بھی میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کہ غزل کے الگ ہو جانے اور ناول اور افسانے لکھنا شروع ہونے کے بعد قصیدوں اور داستانوں کو زیادہ اہمیت ملی یا پھر ان نئی اصناف کو؟ اگر نئی اصناف کو زیادہ اہمیت ملی تو اس کی وجہ کیا تھی؟ کیا ایسا نہیں کہ یہ نئی اصناف intellectually زیادہ ترقی پانے والے ذہن سے مطابقت رکھتی ہیں؟ آپ کے خیال میں غزل اور نظم کی موجودگی میں ماہیے کی کیا حیثیت ہے؟ اور کتنے فیصد intellectually developed اذہان کے لئے یہ قابلِ قبول ہے؟

۳۔ جہاں تک فلمز کا تعلق ہے تو دنیا کے جس خطے میں ہم رہ رہے ہیں وہاں کے مشاہدے کے مطابق تو میری رائے یہی ہے کہ یہاں فلم بین طبقہ دراصل انہیں لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کو فوک لور زیادہ اپیل کرتا ہے۔ اسی لئے اگر ساحر جیسے بڑے شعراء ان کے لئے بننے والی اردو فلمز میں ان کی لوک شاعری کی کسی صنف کو استعمال کرتے ہیں تو یہ یقیناً معاشرے کے ایک حصے کی ذہنیت کو ان کے بخوبی سمجھ لینے کی دلیل ہے۔ فلمی شاعری کے تقاضے الگ ہوتے ہیں۔ اس بات کا علم آپ کو بھی بخوبی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا قتیل کی بجائے میر، غالب اور اقبال کی شاعری فلم میں زیادہ استعمال ہوتی۔ کیا آپ فلمی شاعری کو غیر فلمی شاعری کے ساتھ یکساں درجے کا سمجھتے ہیں؟

ایک اور سوال میں صرف اپنی معلومات کے لئے کرنا چاہ رہی ہوں اور وہ یہ کہ پنجابی زبان میں غزل گوئی کا آغاز کب ہوا ہے اور سب سے بڑا غزل گو شاعر کسے مانا جاتا ہے؟ آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔

پلوشہ

۶ر اکتوبر ۲۰۰۳ء

پلوشہ بی بی سلام مسنون

آپ کے خط کا جواب خاصی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ای میلز سے آپ کو میری مجبوریوں اور مصروفیات کا اندازہ ہو چکا ہے اس لئے ان کا ذکر یہاں کرنا مناسب نہیں ہے۔آپ اس تاخیر کی اجازت دے چکی ہیں۔لہٰذا بغیر کسی رسمی تمہید کے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ ایک بنیادی اور اصل سوال کے جواب کے اندر سے محض مزید سوال اٹھاتے چلے جانے سے بات نہیں بنے گی جب تک پہلے سوال کو کسی نتیجے تک نہ پہنچا دیا جائے۔آپ کا بنیادی سوال یہ تھا کہ لوک شاعری کا کوئی مصنف نہیں ہوتا، یہ پورے معاشرے کی ترجمانی کرتی ہے۔اس لئے کوئی لوک شاعری کیونکر ادبی صنف بن سکتی ہے کہ اس میں تو باقاعدہ مصنف ہوتا ہے۔میں نے اس سلسلے میں ہندی دوہا، ہندی گیت دو اہم مثالیں دی ہیں کہ یہ قدیم ہندوستان کے لوک گیت تھے اور اب ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے ادب کا اہم حصہ ہیں۔دوہا اور گیت دونوں ادبی طور پر لکھے جا رہے ہیں اور ان کے شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔اس لئے ہمیں پہلے یہیں رُک کر طے کرنا چاہئے کہ کیا لوک گیت کا ادبی صنف میں ڈھلنا روا ہے یا نہیں ہے؟ یہ ایک اصولی بات طے ہو گی یا رد ہو گی۔رد ہونے کی صورت میں ہمیں اردو اور ہندی کے سارے ادبی دوہوں اور ادبی گیتوں سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا اور قبول ہو جانے کی صورت میں ماہیے کے ادبی صنف میں ڈھلنے کا ایک اور جواز سامنے آ جائے گا۔لہٰذا پہلے اس نکتے پر رُکئے اور اسے واضح کیجئے کہ یہاں تک کیا طے ہوتا ہے۔یہ آپ کا پیش کردہ بے حد اہم اور بنیادی نکتہ ہے۔تاہم اس بنیادی نکتے پر اصل توجہ مرکوز رکھنے پر اصرار کے ساتھ میں یہاں آپ کے اٹھائے گئے نئے تین سوالات کے جواب میں بھی اپنی سوچ کے مطابق کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔

۱۔ آپ نے لکھا ہے:''**لفظیات اور صوتیات کے حوالے سے اردو ہندی سے زیادہ قربت رکھتی ہے یا پنجابی سے؟**'' آپ کے ذہن میں کیا بات ہے آپ کھل کر کہتیں تو میں زیادہ وضاحت

کر سکتا تاہم جہاں تک میں اس حساب کتاب کی نوعیت سے اندازہ کر پایا ہوں اس کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں کہ جو ہندی بہت زیادہ سنسکرت آمیز ہے اس کے مقابلہ میں اردو زبان ـ۔پنجابی اور سرائیکی سے زیادہ قریب ہے۔اس کی مثال کے لئے صرف ولی دکنی کے دور میں ہی چلے جائیں تو اس دور کی شاعری سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس پر پنجابی اور سرائیکی طرز کی مقامی زبانوں کا کتنا گہرا اثر تھا۔تاہم زبانوں کے معاملہ میں کوئی ایسا نسخہ بنانا مشکل ہے کہ اس میں فلاں زبان اتنے ماشہ ،فلاں زبان اتنے تولہ اور فلاں زبان اتنے گرام شامل ہے۔سو مختلف اوقات میں ہندوستان کی مختلف مقامی زبانوں کے الفاظ اردو نے اپنے اندر جذب کئے ہیں۔شیرانی صاحب کی تحقیق کے مطابق تو اردو کا مولد ہی پنجاب تھا۔تاہم یہ سب اضافی باتیں ہیں۔میرے نزدیک ان کا آپ کے بنیادی سوال سے کچھ اتنا زیادہ تعلق نہیں ہے۔تاوقتیکہ آپ اس کی خود وضاحت کر دیں کہ اس کا یہ تعلق ہے۔

۲۔ آپ کے دوسرے سوال میں بیک وقت دو الگ الگ سوال ہیں۔ایک سوال یا اعتراض یہ کہ:

''ماہیے کے جواز'' میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ کسی بھی ادبی صنف کا آغاز کسی پلاننگ کے ساتھ نہیں ہوتا۔اس سے مجھے صد فیصد اتفاق ہے۔لیکن یہ معاملہ کسی نئی صنف کے آغاز کا نہیں بلکہ ادب کی ایک قسم کی صنف کو ادب کی دوسری قسم میں بطور صنف متعارف کرانے کا ہے۔''

جواباً عرض ہے کہ میرے مضمون ''ماہیے کا جواز'' میں بات چل رہی تھی ان معترضین کی جو کہہ رہے تھے کہ ثلاثی اور ہائیکو وغیرہ سہ مصرعی اصناف کے ہوتے ہوئے ماہیے کا نیا تجربہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔اور اسی تناظر میں ان کو جواب دیا جا رہا تھا۔آپ کے سوال کے جواب میں تو بہت ہی سیدھی سی اور آسان سی دو مثالیں دے دی ہیں ہندی دوہے اور ہندی گیت کی جو بڑی کامیابی کے ساتھ لوک شاعری سے ادبی شاعری میں ڈھل گئے۔

آپ کے دوسرے سوال کے اندر کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ داستانوں کے ہوتے ہوئے ناول اور افسانے،اور قصیدے کے ہوتے ہوئے غزل ابھری۔غزل قصیدے سے اور ناول و افسانے

داستانوں سے زیادہ مقبول ہوگئے۔۔۔سو وضاحتاً عرض ہے کہ غزل کے قصیدے سے الگ ہونے کے بعد بھی ایک عرصہ تک قصیدے کا بول بالا رہا۔غزل نے حضرت امیر خسرو کے دور سے سفر شروع کیا اور صدیوں پر محیط ایک عرصہ تک قصیدے کے سامنے کسمپرسی کے عالم میں رہی۔ یہ تو کئی صدیوں کے بعد غزل نے جا کر طاقت پکڑی تھی۔غزل کے مقبول ہو جانے کے بعد بھی قصیدے کی روایت تب تک مضبوطی کے ساتھ قائم رہی جب تک برصغیر میں بادشاہت رہی۔اس لئے قصیدے کے غائب ہونے میں بادشاہت اور شاہی دربار کے غائب ہونے کی وجہ شامل ہے۔اسی طرح داستان تو بجائے خود ایک افسانوی مجموعہ ہوتی تھی۔ جو کئی افسانوں کو الگ الگ بیان کرتی تھی اور پھر سارے افسانوں کو گویا غزل کے اشعار کی طرح پرو لیتی تھی۔یعنی داستان میں بیان کی گئی کہانیاں اپنی الگ اکائی بھی رکھتی تھیں اور پوری داستان کی مالا میں پروئی ہوئی بھی تھیں۔ داستانیں بھی درحقیقت لوک گیت کی طرح سنائی جانے والی چیزیں تھیں۔ وقت بدلنے کے ساتھ اور مختلف سیاسی وسماجی صورتحال کے اثر انداز ہونے کے نتیجہ میں وہی کہانیوں کی صنف افسانوں کا چولہ پہن کر خالصتاً ادبی چیز بن گئی۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی اچھی ادبی صنف کی کسی دوسری اچھی ادبی صنف سے کوئی دشمنی یا مقابلہ بازی نہیں ہوتی۔ ہر ایک کا اپنا اپنا دائرۂ کار ہوتا ہے۔اس لئے ماہیے کو کسی صنف کے مدمقابل لانے کا رویہ مناسب نہیں ہے۔اگر اس بنیاد پر بات کی جاتی تو غزل کو اپنی ابتدائی دو تین صدیوں کے بعد ہی مر جانا چاہئے تھا کیونکہ دو تین صدیوں تک تو وہ قصیدے کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ کسی شمار میں ہی نہیں تھی۔

تیسرے سوال میں آپ نے فلمی شاعری اور ادبی شاعری کے معیار اور فرق کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے فلمی شاعری کو لوک شاعری سے قریب قرار دیا ہے۔لیکن میرا خیال ہے کہ آپ نے میرے پہلے جواب پر توجہ نہیں کی۔ میں نے لکھا تھا:

''ماہیا جو پنجاب کی لوک شاعری تھی ایک عرصہ تک گایا جاتا رہا۔فلمی شاعری نے آ کر جب اس لوک گیت سے استفادہ کیا تو ایک طرح سے لوک شاعری اور ادب کے درمیان رابطے کا کام کر دیا۔ایسا کسی ادبی منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہوا۔''

میں نے فلمی شاعری کو لوک شاعری اور ادب کے درمیان رابطے کی کڑی کے طور پر پیش کیا تھا۔میرے اس جملے پر آپ غور کریں تو آپ کو مزید وہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی جو آپ نے فلمی اور لوک شاعری کے حوالے سے لکھا ہے۔تاہم یہیں سے ہم پھر آپ کے اصل اور بنیادی سوال اور اس کے جواب کی طرف لوٹتے ہیں کہ کیا لوک گیت ادبی صنف میں ڈھل سکتا ہے؟اگر ایسا کسی مصنوعی طریقے سے نہیں بلکہ فطری انداز میں ہو رہا ہے تو ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے،اب بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ بھی ہو سکتا ہے۔

ابھی تک کی ساری گفتگو میں اٹھائے گئے آپ کے سوالوں کے جواب اپنی توفیق اور علم کے مطابق دے دیئے ہیں۔اب میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس کے بعد جو کچھ لکھنا چاہیں،ایک خط اور سوالنامہ کی صورت میں نہیں بلکہ مضمون کی صورت میں لکھیں۔اس سے آپ کا نکتہ نظر بہتر طور پر کھل کر سامنے آ سکے گا اور مجھے بھی آپ کے علمی نکات کو ان کے پورے تناظر میں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

پنجابی غزل کی ابتدا کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے۔اس کے بارے میں اس زمانے میں پڑھا تھا جب ایم اے پنجابی کرنے کا موڈ بنا تھا۔لیکن اب کچھ یاد نہیں ہے۔غزل کے شاعروں میں صوفی فقیر محمد فقیر کی غزل مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ان کے بعض شعر آج بھی یاد ہیں۔

امید ہے آپ اپنی جستجو کے اس سفر کو اب بڑی سطح پر جاری رکھیں گی اور اس سلسلہ میں باقاعدہ مضمون لکھیں گی۔ میں آپ کے مضمون کا خیر مقدم کروں گا اور اسے ''جدید ادب'' میں شائع کروں گا۔اللہ آپ کو خوش رکھے۔ والسلام

دعا کے ساتھ

حیدر قریشی

۲۴ر اکتوبر ۲۰۰۳ء

(مطبوعہ **جدید ادب** جرمنی، شمارہ جنوری ۲۰۰۴ء)

حیدرقریشی سے بذریعہ انٹرنیٹ انٹرویو

اختر رضا سلیمی (اسلام آباد)

سوال: آپ کب سے لکھ رہے ہیں؟

جواب: ۱۹۷۱ء میں پہلی غزل کہی تھی۔ ویسے چھوٹی موٹی تک بندی تو اسکول کے زمانے سے جاری تھی۔

سوال: پہلی مطبوعہ تحریر؟

جواب: ہفت روزہ ''لاہور'' کے غالباً مئی ۱۹۷۲ء کے کسی شمارہ میں وہ غزل شائع ہوئی، جو میں نے ۱۹۷۱ء میں کہی تھی۔

سوال: جب ''اوراق'' لاہور کے ذریعے ماہیے کے درست وزن کی نشاندہی کی گئی تو آپ نے اسے ایک تحریک کی صورت دی۔ ابتدا میں آپ کے موقف کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ کیا آپ کو یقین تھا کہ مستقبل قریب میں آپ کے موقف کو پذیرائی ملے گی؟

جواب: میرے ذہن میں صرف اتنی سی بات تھی کہ ماہیے کے بارے میں بے خبری کے باعث جو ایک چھوٹی سی غلطی راہ پا گئی ہے اس کی نشاندہی ہونے پر ماہیا نگار حضرات اسے خوشدلی سے درست کر لیں گے۔ اسی لئے میں نے ماہیے کی لَے کو مدِ نظر رکھ کر ماہیے کہنے شروع کئے۔ ساتھ ہی احباب پر ماہیے کا وزن واضح کرنا شروع کیا۔ میرے گمان میں تو یہ بھی نہیں تھا کہ ایک سیدھی سی بات کہنے پر مجھے اتنا برا بھلا کہا جائے گا اور اس قدر مخالفت کی جائے گی۔ بس جیسے ہی مخالفت

شروع ہوئی ہمارے موقف کو پذیرائی ملنا شروع ہو گئی۔ آپ کو مزے کی ایک بات بتاؤں۔ مجھے یار لوگوں کی بے جا مخالفت پر حیرانی تھی۔ اسی دوران ڈاکٹر انور سدید ایبٹ آباد آئے۔ میں نے بڑی سادگی کے ساتھ اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ یار لوگ سیدھی سی بات کو سمجھ ہی نہیں رہے۔ تب ڈاکٹر انور سدید نے مسکرا کر کہا ادب میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ مخالف کو مخالفت کرنے دیں۔ آپ اپنے موقف کو مضامین کے ذریعے پیش کرنا شروع کر دیں۔ سو مضامین لکھنے کے سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید کا مشورہ بے حد مفید رہا۔ بعد میں جب ''تخلیق'' لاہور میں میری شدید مخالفت کی گئی تب میں نے اپنی تائید میں دوسرے مقتدر ادباء کے ساتھ انور سدید کی تحریروں کے حوالے بھی دیئے تو مجھے یہ دیکھ کر پہلے تو حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر انور سدید جیسے ''حق گو نقاد'' نے اپنے لکھے کا دفاع کرنے کی بجائے ''معنی خیز'' خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ ادب کے تئیں ایک تو ان کی ترجیحات بدل چکی ہیں اور وہ زیادہ وقت صحافت کو دے رہے ہیں دوسرے یہ کہ غالباً وہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے مجھے اکیلے ہی مخالفین کا سامنا کرنے دینا چاہ رہے تھے۔ سو مجھے تو مخالفت کا بھی گمان نہ تھا۔ اور یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میری اتنی شدید مخالفت نہ ہوتی تو ماہیے کو ایسی پذیرائی نہیں ملتی۔

سوال: کسی سلسلے میں جب آدمی کی مخالفت ہونے لگتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ میں نے مفت کی درد سری مول لے لی ہے۔ آپ نے جب ماہیے کے درست وزن کی تحریک کا بیڑہ اٹھایا تو ہر طرف سے آپ کی مخالفت شروع ہو گئی۔ آپ کو اس وقت کبھی ایسا خیال آیا؟

جواب: جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مخالفت پر مجھے بڑی حیرانی ہوتی تھی کہ اتنی سیدھی سی بات، بالکل سامنے کی بات لوگوں کو سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی! لیکن وقت کے ساتھ ساتھ دنیا کے رنگ ڈھنگ واضح ہوتے گئے اور ادبی زندگی، جینے کا طریقہ بھی سمجھ میں آتا گیا۔ کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا ہے کہ ماہیا میری پہلی ترجیح نہیں ہے لیکن مجھے اسی میں زیادہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن پھر یہ بھی سوچتا ہوں کہ کوئی ادبی صلاحیت ملنا، اسے بروئے کار لانے کی توفیق ملنا اور پھر اس کا مثمر بہ ثمرات ہونا سب خدا تعالیٰ کی مہربانی سے ہوتا ہے۔ سو اگر وہ مجھے اس میدان میں زیادہ کام کرنے

کی ہمت اورتوفیق دے رہا ہےتو میں اس پربھی اس کاشکر گزار ہوں۔

سوال: ماہیے کے وزن کے حوالے سے کچھ لوگوں نے ابتدا میں آپ کے موقف کی حمایت کی لیکن جلدہی وہ آپ کے موقف کی مخالفت کرنے لگ گئے۔اس تبدیلی کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: بعدمیں مخالفت کرنے والوں میں ماہیا نگارتو صرف ایک ہی ہیں لیکن انہوں نے بھی جتنے ماہیے کہے ہیں' مخالفت کرنے کے باوجود ہمارے موقف کے مطابق ہی کہے ہیں۔لہٰذاان کی مخالفت کا سبب ازخود ظاہر ہے۔باقی جن ایک دو دوستوں نے موقف تبدیل کرنے کی کوشش کی میں نے بروقت ان کی نشاندہی شواہد کے ساتھ کردی۔میری کتاب 'اردو ماہیے کی تحریک' میں ان کا مکمل حوالہ موجود ہے وہ اس سے آگے بات کریں تو میں مزید وضاحت کرنے کو تیار ہوں۔انہوں نے کسی ذاتی رنجش میں ہی موقف تبدیل کیا تھا۔تاہم ہمارا موقف کسی فرقے کا عقیدہ نہیں ہے کہ اس سے اختلاف کرنے والوں کو مرتد قرار دے دیا جائے' یا ان کی مخالفت پر کمر کس لی جائے۔

فکر ہرکس بقدر ہمت اوست، ہاں جب ہم پرحملہ ہوگا تب ہم اپنا دفاع ضرور کریں گے۔

سوال: آپ نے ماہیے کی سہ مصرعی ہیئت پراصرار کیا حالانکہ پنجابی میں دونوں ہئیتیں (ڈیڑھ مصرعی اورسہ مصرعی) ملتی ہیں؟

جواب: پہلے تو یہ وضاحت کردوں کہ اب تک کی تحقیق کے مطابق پنجابی میں ماہیے کی دو نہیں بلکہ تین تحریری صورتیں ملتی ہیں۔ایک یک سطری' دوسری ڈیڑھ سطری اور تیسری سہ مصرعی۔اور یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ میں نے سہ مصرعی ہیئت پراصرار کیا ہے۔آپ میری کتاب ''اردو ماہیے کی تحریک'' میں شامل میرے مضامین ''اردو ماہیے کی تحریک'' اور ''پنجابی لوک گیت ماہیے کی تحریری ہیئت'' دیکھ لیں اور ''اوراق'' شمارہ جولائی اگست ۱۹۹۹ء میں شامل میرا مضمون ''ماہیے کی بحث'' بھی دیکھ لیں۔میں نے کہیں بھی اصرار نہیں کیا لیکن سہ مصرعی ہیئت کو پنجابی میں بھی اور اردو میں بھی ماہیے کی مقبول صورت ضرور لکھا ہے۔اپنے لکھے کو یہاں دہرا دیتا ہوں:

''پنجابی ماہیے کا بطور لوک گیت مجموعی وزن یہی بنتا ہے فعلن فعلن فعلن ر فعلن فعلن فع ر فعلن فعلن فعلن (دوسرے متبادل اوزان میں بھی اسی طرح ایک سبب کی کمی رہے گی) اب

اسے چاہے ایک مصرعہ بنا کرلکھ لیں' ڈیڑھ مصرعے بنا کرلکھ لیں یا تین مصرعوں کی مقبول صورت کو اپنا لیں۔ماہیے کا مجموعی وزن بہرحال وہی رہے گا جو ماہیے کی لَے کے مطابق ہے۔مجھے ڈیڑھ مصرعی ہیئت پرکوئی اعتراض نہیں ہے تاہم اب بصری لحاظ سے سہ مصرعی ماہیا زیادہ اچھا لگتا ہے۔۔۔۔سو اب ماہیے کی تحریک جس مقام پرآ گئی ہے' یہاں ڈیڑھ مصرعی ہیئت کو غلط کہے بغیر میں یہ ضرور کہوں گا کہ سہ مصرعی صورت میں ماہیا زیادہ ہرا بھرا لگتا ہے''۔

تو جناب میں تو تینوں ہیئت میں ماہیے کو مانتا ہوں لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ اس سے ماہیے کے وزن میں نقب نہ لگائی جائے۔ہیئت کو ''چور دروازہ'' بنا کر ماہیے کی لوک لَے سے الگ نہ کیا جائے۔ویسے ڈیڑھ مصرعی ہیئت پر بے جا اصرار کرنے والوں سے میں نے ''اوراق'' کے مذکورہ شمارہ میں یہ سوال کئے تھے کہ وہ لوگ اس وقت کہاں تھے جب پنجابی کے مقتدر دانشور سہ مصرعی ہیئت میں ماہیے کی کتابیں مرتب کرکے چھاپ رہے تھے اور یہ سارے کام مقتدر سرکاری ادبی اداروں کی نگرانی میں ہوئے تھے؟ اور اس وقت یہ لوگ کہاں تھے جب ۱۹۸۳ء سے مساوی الوزن ''ماہیے'' کہنے والے سہ مصرعی فارم میں ماہیے کہہ رہے تھے؟ تادمِ تحریر نہ ان مقتدر پنجابی دانشوروں کو کسی نے برا بھلا کہا ہے' نہ مساوی الوزن سہ مصرعی ''ماہیے'' کہنے والوں کو کسی نے میلی نظر سے دیکھا ہے؟ سو اب میرا سوال یہ ہے کہ ڈیڑھ مصرعی فارم کا شوشہ چھوڑنے والوں کے تیروں کا رُخ صرف ہماری ہی طرف کیوں ہے؟ جن اہم پنجابی دانشوروں نے پنجابی ماہیے کی سہ مصرعی فارم والی کتب مرتب کی ہیں اور جن اردو کے مساوی الوزن ''ماہیا نگاروں'' نے اب تک یہی فارم اختیار کررکھی ہے انہیں کیوں بچا لیا جاتا ہے؟ اور صرف ہم پر ہی کیوں ''نظرِ کرم'' فرمائی جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب مخالفین کو ہر سطح پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تب جان بوجھ کر سہ مصرعی فارم کا شوشہ چھوڑنے کے لئے بندے چھوڑے گئے۔یہ واضح حقیقت ہے۔

سوال: آپ کے بقول ماہیا وہی ہے جس کے دوسرے مصرعے میں ایک سبب کم ہو۔بشیر سیفی' ارشد محمود ناشاد اور ان کے ہم نواؤں کا کہنا ہے کہ پنجابی میں نہ صرف مساوی الوزن ماہیے موجود ہیں بلکہ دوسرے مصرعہ میں ایک سبب زائد والے ماہیے بھی موجود ہیں؟

جواب: دراصل انہوں نے میرے مضامین کو دھیان سے نہیں پڑھا۔اس لئے میری کہی ہوئی ایک بات کو آدھا لے اُڑے ہیں۔میری کتاب ''اردو ماہیے کی تحریک'' کے صفحہ نمبر ۱۳۱،۱۳۲ کو پڑھ کر دیکھیں۔میں نے نشاندہی کی ہے کہ پنجابی ماہیے میں صرف مساوی الوزن اور دو حرف کم یا زائد والے ہی نہیں بلکہ چار حرف کم یا زائد والے ماہیے بھی ملتے ہیں۔ایسی صورت میں تو ماہیے کی یہ پانچوں ہیئت رائج کر لینی چاہئیں۔لیکن ایسا غدر اسی صورت میں ہوگا جب آپ پنجابی ماہیے کو اردو عروض کے مطابق دیکھیں گے لیکن اگر آپ ماہیے کی لَے کو بنیاد مان لیں تو پھر نہ کوئی کنفیوژن رہتا ہے نہ کوئی غدر مچتا ہے۔بشیر سیفی تو بہت بہادر آدمی ہیں میرے لکھے کو اپنا موقف بنا کر پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی میری مخالفت بھی کرتے ہیں،انہوں نے ماہیے کی دُھن والے میرے موقف کو بڑے مزے سے اپنا موقف بنا کر بیان کر دیا اور ساتھ ہی میری مذمت بھی فرما دی

جو میرے لکھے سے استفادہ بھی کر رہا ہے
خلاف باتیں وہی زیادہ بھی کر رہا ہے

سوال: آپ نے ماہیے کو پابندِ لَے گردانا ہے۔اُدھر مساوی الوزن ماہیے کے حامیوں کا کہنا ہے کہ دوسرے مصرعے میں ایک سبب کی کمی والا ماہیا لَے میں فٹ نہیں بیٹھتا۔اس تضاد نے ماہیے کے قارئین کو الجھا کر رکھ دیا ہے؟ آپ اپنے موقف کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب: میرے علم میں نہیں ہے کہ کس نے ایسی بات کہی ہے۔لیکن جس نے بھی یہ کہا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کم والا ماہیا لَے پر فِٹ نہیں بیٹھتا،اس نے بڑی ہی بچکانہ بات کی ہے۔۱۹۳۶ء سے اب تک اردو ماہیے کے گائے گئے جتنے نمونے دستیاب ہوئے ہیں سب کے سب ہمارے موقف کی تصدیق کرتے ہیں۔ہمت رائے شرما،قتیل شفائی،قمر جلال آبادی،ساحر لدھیانوی،نذیر قیصر،وِپن ہانڈا تک فلمی ماہیا نگاروں کے کم از کم سات نمونے تو میں خود پیش کر چکا ہوں۔یہ سارے ماہیے،پنجابی لَے کے مطابق لکھے اور گائے گئے ہیں اور انہیں لکھنے والا ہر شاعر ہمارے موجودہ موقف سے بے تعلق تھا اس کے باوجود ہمارے موقف اور ان کے ماہیوں میں جو تعلق ہے وہ صاف ظاہر ہے۔مجھے تو وہ صاحب کوئی بہت بھولے بھالے لگتے ہیں جنہوں نے

ایسی بات کہہ دی۔باقی ماہیے کے سلسلے میں جتنا الجھاوا پیدا کیا جا رہا ہے وہ صرف معترضین اپنے آپ کو اور ایک دوسرے کو خوش کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔جہاں تک ماہیا نگاروں اور ماہیے کے عام قاری کا تعلق ہے وہ ماہیے کو بخوبی جان چکے ہیں معترضین کو بخوبی علم ہے کہ ماہیا نگار ان کی بات کو نظر انداز کر کے درست وزن کے ماہیے کہہ رہے ہیں اور قارئین بھی حقیقت سے آگاہ ہیں۔

سوال: اردو ماہیے پر وزن اور ہیئت کے حوالے سے تو خاصی بحث ہو چکی ہے لیکن اس کے مزاج کو کسی نے درخورِ اعتنا نہیں جانا حالانکہ ماہیے کا اپنا ایک مخصوص مزاج بھی ہے۔اس پر بھی تو بحث ہونی چاہئے؟

جواب: مزاج کے حوالے سے تھوڑا بہت کام تو ہوا ہے لیکن یہ درست ہے کہ اس پر مزید کام کی ضرورت ہے۔تاہم ضروری ہے کہ ماہیے کے مزاج پر بات کرنے والا پنجابی ماہیے کو اس کے ہر پہلو سے کسی نہ کسی حد تک ضرور جانتا ہو۔یہاں مجھے ایک ''نقاد'' یاد آ گئے۔موصوف مجھ پر اس لئے بگڑ گئے کہ میں نے ماہیے کے ڈانڈے ہندی گیت کے ساتھ ریختی جیسی فحش صنف سے کیوں ملا دیئے حالانکہ پنجابی ماہیے میں حمد و نعت سے لے کر فحش گوئی تک ہر موضوع پر ماہیوں کا ذخیرہ موجود ہے۔بندے نے صرف تنویر بخاری کے مرتب کردہ انتخاب ہی کو پڑھ رکھا ہو تو وہ ایسے بچکانہ اعتراض سے بچ سکتا ہے۔سو ماہیے کے مزاج پر بات کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے پنجابی ماہیے کو ہمت کر کے ہر پہلو سے دیکھ اور سمجھ لیں۔

سوال: گزشتہ دس سالوں میں اردو ماہیے کو بے حد پذیرائی ملی،جس میں آپ کی کوششوں کا عمل دخل سب سے زیادہ ہے اور اب تو حیدر اور ماہیا لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔آپ کو کیسا لگتا ہے؟

جواب: اچھا لگتا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ محض اس چکر میں بعض اچھے دوست گنوا بیٹھا ہوں۔حامد سروش اور سیدہ حنا سے میری بہت اچھی دوستی تھی وہ ہاتھ سے گئی۔بشیر سیفی سے گہری دوستی نہ سہی لیکن اچھی ہائے ہیلو تھی۔ماہیے کی بحث میں ان کے آنے سے پہلے انہیں مجھ سے ایک دوستانہ سی شکایت ہوئی تھی۔میں اسے دور کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی انہوں نے اپنی کارروائی شروع کر دی۔سو اچھا لگنے کی خوشی کے ساتھ ہلکا سا تاسف کا احساس بھی ہے۔

سوال: کوئی بھی صنف سخن ہوارتقائی مراحل بتدریج طے کرتی ہے۔کسی بھی صنف سخن کو پنپنے میں خاصا وقت لگتا ہےلیکن ماہیا اچانک آیااور چھا گیا۔اس کے اسباب پر روشنی ڈالیں گے؟

جواب: میرے ذہن میں اس کے دو اسباب آتے ہیں۔ہوسکتا ہے اور اسباب بھی سامنے آئیں۔پہلا سبب تو یہ کہ اردو میں کسی سہ مصرعی صنف کی جستجو بڑھ گئی تھی۔ثلاثی، ہائیکو اور ترو ینی جیسی سہ مصرعی اصناف شاعری میں کسی سہ مصرعی صنف کی جستجو کا احساس دلاتی ہیں۔ان سب کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے۔تاہم ان میں سے کوئی بھی شاید ثقافتی سطح پر جُڑ نہیں پا رہی تھی۔ان کے برعکس ماہیا تو یہاں کی ثقافت میں رچا ہوا تھا سو جیسے ہی سہ مصرعی صنف کی طلب کو ماہیا ملا، ماہیا مقبول ہو گیا۔دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ حالیہ دس برسوں میں جتنی ماہیے کی مخالفت ہوئی ہے کسی اور ادبی اشو پر اتنی کسی کی مخالفت نہیں ہوئی اور یہ تو ہوتا ہے کہ جس چیز کی زیادہ مخالفت ہو لوگ اس میں زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔سو ماہیے کے مخالفین نے بھی اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔لوگوں کو اس طرف متوجہ کر دیا ہے۔باقی لوگ خود سیانے ہیں، دونوں موقف جاننے کے بعد خود ہی بہتر فیصلہ کر لیتے ہیں سو اس لئے بھی ماہیا مقبول ہوا ہے۔

سوال: بعض نقاد تو یہ خدشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ماہیا اگر طوفان کی صورت آیا تو جھاگ کی صورت بیٹھ بھی جائے گا یعنی ماہیا کا کوئی مستقبل نہیں؟

جواب: دنیا جس ڈگر پر جا رہی ہے مجھے تو اس سے ادب کے مستقبل پر بھی تشویش ہونے لگتی ہے۔جہاں تک ماہیے کا تعلق ہے ہم نے اپنی توفیق کے مطابق کام کیا ہے۔اور ہمارے کام سے زیادہ خدا نے پھل پھول لگا دیئے ہیں۔اردو میں کتنی اصناف کبھی بے حد مقبول تھیں اب ان کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔اس کے باوجود ادب کی ترویج کی تاریخ میں ان اصناف کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔سو ماہیے نے تو اتنے مختصر سے عرصہ میں اپنے لئے ایک اہم جگہ بنا لی ہے۔اس لئے مجھے اس کے مستقبل کے حوالے سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ویسے آپ دیکھیں تو اس قسم کا پروپیگنڈہ وہ لوگ کر رہے ہیں جو ماہیے کی بحث میں علمی لحاظ سے ہر سطح پر شکست کھا چکے ہیں اور اپنے دل کے بہلانے کے لئے نجومی بابا بن رہے ہیں۔

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ حیدر نے ماہیے کو سستی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے؟

جواب: اگر میرے مجموعی ادبی کام کے تناظر میں دیکھا جائے تو ماہیے کے چکر میں میرا دوسرا کام کسی حد تک نظر انداز ہوا ہے۔اپنی غزلوں، اپنے خاکوں اور افسانوں، اپنے سفرناموں اور ''کھٹی میٹھی یادوں'' کے حوالے سے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں لیکن میں ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ ماہیے کی بحث میں میرا وہ سارا کام پس پشت چلا گیا ہے۔سو ماہیے کی شہرت مجھے سستی نہیں مہنگی پڑی ہے۔پھر اوپر سے یار لوگوں کی ملامت۔جو بھی علمی سطح پر لاجواب ہوا اس نے شخصی دشمنی قائم کر لی۔جہاں چور اور بے وزن شاعروں اور افسانہ نگاروں کو آسمان پر چڑھا دیا گیا وہاں حیدر قریشی کے لئے زمین پر رہنے کا حق بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔سو ماہیے والی شہرت سے تنویر سپرا مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا ہے

عزت بڑھی تو ساتھ ہی رُسوائی بڑھ گئی
تنخواہ کے حساب سے مہنگائی بڑھ گئی

ویسے آپ دیکھیں کہ جن لوگوں کی ادب میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی وہ صرف اس لئے اہم ہو گئے کہ وہ ماہیے کے مخالف ہیں۔تو ماہیے نے تو اپنے مخالفوں کو بھی شہرت عطا کر دی ہے۔

سوال: ابتدا میں ماہیے لکھنے والے محدود تھے تو ماہیوں کا معیار بلند تھا لیکن جوں جوں ماہیے لکھنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی معیار کم ہوتا گیا اور اب تو بقول شخصے اچھا ماہیا ڈھونڈنا پڑتا ہے؟

جواب: پہلی بات تو یہ کہ جس صنف میں بھی زیادہ لکھنے والے ہوں گے اس میں غیر معیاری میٹر اتنا ہی زیادہ ہو گا۔سو یوں صرف ماہیے کو مطعون کرنا ٹھیک نہیں ہے معیار کی صورتحال تو ہر مقبول صنف میں تقریباً ایک جیسی ہے۔باقی یہ رسائل کے مدیران پر بھی منحصر ہے کہ وہ کس معیار کی تخلیقات قبول کرتے ہیں۔''جدید ادب'' کے دونوں شمارے اٹھا کر دیکھ لیں اور ان میں شامل ماہیوں کے معیار پر مجھ سے بات کر لیں۔''اردو دنیا'' جرمنی میں چھپنے والے ماہیوں کا عمومی معیار بھی بہت عمدہ ہوتا ہے۔پھر آپ ''اوراق'' میں چھپنے والے ماہیوں کے عمومی معیار کو دیکھ لیں۔''کوہسار'' بھاگل پور اور ''اسباق'' پونہ میں بھی عام طور پر معیاری ماہیے چھپتے ہیں۔

''نیرنگِ خیال'' کا ماہیا نمبر معیار کے لحاظ سے بھی ایک عمدہ نمبر ہے۔ چھوٹی موٹی استثنائی مثالیں تو درگزر کرنا پڑتی ہیں۔ ویسے آپ یہ بھی دیکھیں کہ ایسی بات کہنے والے وہ لوگ تو نہیں جو علمی میدان میں ہر سطح پر مار کھانے کے بعد کبھی نجومی بننے لگے ہیں اور کبھی ماہیے کے معیار پر بڑھی دکھانے لگے ہیں۔ میرے ماہیوں کو بھی اب تو برا بھلا کہا جانے لگا ہے۔ بہرحال جیسے کسی کو خوشی ملتی ہے خوش رہے!

سوال: آپ نے تو ماہیے پر تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی تینوں سطحوں پر کام کیا ہے۔ آپ کے علاوہ چند ایسے نام جنھوں نے تحقیقی و تنقیدی سطح پر کام کیا ہو؟

جواب: تحقیقی سطح پر مربوط کام تو دوسرے دوستوں نے بہت کم کیا ہے تاہم میری تحقیق میں بہت سارے دوستوں نے ایسا میٹر تلاش کرنے میں میری مدد کی جس سے میری تحقیق کو ٹھوس بنیاد ملی۔ ایسے دوستوں میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، احمد حسین مجاہد اور عارف فرہاد کے نام خاص طور پر لوں گا۔ ہمت رائے شرما جی نے بھی بے حد اہم نوعیت کے میٹر کی فراہمی میں میری بہت مدد کی۔ ویسے ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما جی کی دریافت ڈاکٹر مناظر عاشق کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ مجھے اس پر بعد میں مربوط کام کرنے کی توفیق ملی۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے اسے دو خانوں میں بانٹ لیں۔ ماہیے کی پہچان کرانے میں گہرے عروضی حوالے سے آصف ثاقب، احمد حسین مجاہد، ناوک حمزہ پوری، شارق جمال، اسلم حنیف، ڈاکٹر مناظر عاشق اور بعض دیگر دوستوں نے اپنی اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کام کیا ہے۔ جبکہ ماہیے کے وزن اور ثقافتی پہچان کے حوالے سے سعید شباب، امین خیال، ناصر عباس نیر، ڈاکٹر انور سدید، گوہر شیخ پوری، کے بعض مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ماہیے کی عمومی بحث اور ماہیا نگاروں کی ماہیا نگاری پر تجزیاتی یا تعارفی مضامین کو ماہیے کی عملی تنقید میں شمار کرنا چاہئے۔ اس میدان میں ڈاکٹر جمیلہ عرشی، فراز حامدی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، اکبر حمیدی، ہارون الرشید، عارف فرہاد، اختر رضا کیکوٹی، محمد وسیم انجم، ناصر نظامی، سعید شباب، اور متعدد دیگر نام ہیں جو لگن اور خلوص کے ساتھ ماہیے کی عملی تنقید میں اپنی اپنی توفیق کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ماہیے کی تنقید کے حوالے سے ماہیا نگاروں نے نہ

سکہ بند نقادوں کا انتظار کیا، نہ کسی کے بارے میں گلے شکوے کئے، نہ کسی کو طعنے دیئے، ادب کے اس عمومی رویے کے برعکس ماہیا نگاروں نے اپنے تنقید نگاروں کا کارواں بھی خود ہی تشکیل دیا اور سارا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا۔

سوال: آپ نے ایک جگہ ماہیے کو ''کتابِ دل'' کہا ہے۔ اس کی وضاحت کریں گے؟

جواب: یار! یہ تو سیدھی سی بات ہے اس کی کیا وضاحت کروں۔ دل اور دماغ کی تفریق کو ذہن میں رکھیں اور پھر کتابِ دل پر غور کریں۔ ماہیا گہری فکر کے مقابلہ میں قلبی کیفیات کی زیادہ بہتر طور پر عکاسی کرتا ہے۔ دل کی باتیں دوسرے دل میں بھی جلد ہی اتر جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ماہیا اپنے اظہار کی سادگی اور بیانیہ میں ہی لطافت پیدا کر دکھاتا ہے۔

سوال: کیا ماہیا عشقیہ مضامین کے علاوہ دیگر موضوعات کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا؟

جواب: پنجاب کے بیشتر لوک گیت کسی خاص خاص علاقے میں زیادہ مقبول ہیں۔ ماہیا واحد لوک گیت ہے جو پنجاب کے ہر علاقے سے لے کر صوبہ سرحد کے ہندکو اور کشمیر کے گوجری علاقہ تک یکساں مقبول ہے اور اس مقبولیت کا ایک سبب یہ ہے کہ ماہیا زندگی کے ہر شعبہ کا احاطہ کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا رُخ نہیں جو ماہیے کا موضوع نہ بنا ہو۔ محبت سے سیاست تک ہر موضوع ماہیے کا موضوع رہا ہے۔ جب پنجابی ماہیے میں سارے موضوعات پر ماہیے ملتے ہیں تو اردو ماہیے کے لئے بھی سارے موضوع روا ہیں۔ البتہ اس میں اردو ماہیا نگاروں کو یہ احتیاط کرنا پڑے گی کہ موضوع کے ساتھ اس کے مزاج کو بھی ملحوظ رکھیں۔ اس وضاحت کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ ماہیے کا غالب موضوع محبت ہی ہے۔ اس لحاظ سے ماہیے کو غزل کا ہم مزاج کہہ سکتے ہیں کہ غزل کا غالب موضوع بھی محبت ہے جبکہ غزل میں بھی سارے موضوع برتے جا سکتے ہیں۔ سو ماہیے میں بھی ایسا کیا جا سکتا ہے، بس برتاؤ کا سلیقہ آنا چاہئے۔

سوال: انوار فیروز کے نام ایک خط میں آپ نے ماہیے سے ملتی جلتی ایک جرمن لوک صنف کا ذکر کیا تھا اس میں اور ماہیے میں کیا مماثلتیں ہیں؟

جواب: میں ''کوہسار'' بھاگلپور میں چھپنے والے اپنے مضمون ''مزید۔۔۔ کچھ ماہیے کے بارے

میں‘ اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ یورپ بھر میں کارنیوال کا جوجشن منایا جاتا ہے اس میں صرف جرمنی میں ’’Bütten reden‘‘ ضرور ہوتی ہے۔ مجھے اس کا علم ارشاد ہاشمی صاحب چیف ایڈیٹر ’’اردو دنیا‘‘ کے ذریعے ہوا تھا۔اس شاعری کی کھوج لگائی تو پتہ چلا کہ اس میں مصرعوں کی تعداد مختلف ہوتی رہتی ہے تاہم جو Bütt سہ مصرعی یا ڈیڑھ مصرعی ہیں وہ حیرت انگیز طور پر ماہیے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ کارنیوال کے موقعہ پر پڑھی جانے والی یہ شاعری صرف اور صرف طنز و مزاح پر مشتمل ہوتی ہے۔اسے حسنِ اتفاق کہئے کہ پنجابی ماہیے میں بھی طنزیہ اور مزاحیہ ماہیوں کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ میں اس مشابہت پر کام کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی جاب کی مصروفیت‘ گھریلو ذمہ داریاں اور پہلے سے موجود ادبی ذمہ داریاں اس کی مہلت ہی نہیں دے رہیں۔ یہاں ایک Bütt ترجمہ کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ترجمہ ارشاد ہاشمی نے کیا ہے:

Burgermeister ist sehr schlau۔۔۔۔۔۔۔افسر وہ سیانا ہے

Wen viel zu tun ist ۔۔۔۔۔۔۔کام کا زور ہو تو

Macht er oft Blau ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کر لیتا بہانہ ہے

ارشاد ہاشمی نے جرمن زبان میں ایک ماہیا کہا ہے۔اسے جرمن میں پہلا ماہیا کہا جاسکتا ہے لیکن جرمن احباب اسے پڑھ کر شاید Bütt قرار دیں:

Es gibt nicht zu lachen

Ausländer Kommen

Hier muß sauber machen

سوال: ماہیے پر آپ کی اگلی کتاب کونسی آرہی ہے؟

جواب: میں نے ’’ماہیا۔۔۔علمی بحث سے غوغائے رقیباں تک‘‘ کا بیشتر کام مکمل کر لیا ہے۔لیکن اسے چھپوانے میں مجھے ابھی تھوڑا تامل ہے۔ مجھے ہلکا سا احساس ہے کہ شاید میری مخالفت میں ظلم کی حد تک چلے جانے والے دوستوں کو کسی مرحلے پر اپنی زیادتی کا احساس ہو جائے۔اس کے تھوڑے سے آثار ایک دو طرف سے دکھائی بھی دیئے ہیں۔سو اگر متعلقہ دوست

سکوت اختیار کرتے ہیں تو میں اس کتاب کی اشاعت ہی روک دوں گا تاکہ جو ہو چکا اس پر مٹی ڈال دی جائے۔لیکن اگر یہ صرف ایک دھوکا ہوا تو پھر مجھے مجبوراً وہ سارا ریکارڈ کتابی صورت میں محفوظ کرنا ہوگا۔سرِ دست میں ماہیے کے حوالے سے اپنی تین کتابیں ترتیب دے رہا ہوں۔۱۔ماہیوں کا دوسرا مجموعہ۲۔’’اردو ماہیے کی تحریک‘‘ کی اشاعت کے بعد کے مطبوعہ مضامین۔اس میں ’’غوغائے رقیباں‘‘ والا میٹر نہیں ہوگا۔۳۔ماہیے کے جن مجموعوں کے لئے مجھ سے پیش لفظ یا تاثرات لکھوائے گئے ان کا مجموعہ۔تاہم اس میں صرف وہی میٹر شامل کروں گا جو مطبوعہ کتب میں چھپ چکے ہیں۔لہٰذا جن احباب نے مجھ سے تاثرات لکھوائے ہیں لیکن ابھی تک اپنے مجموعے نہیں چھپوائے وہ اپنے مجموعے جلد چھپوالیں۔

سوال: آپ نے غزل بھی کہی‘ نظم بھی۔افسانہ بھی لکھا‘ انشائیہ اور خاکہ بھی۔تحقیق بھی کی اور تنقید بھی اور ان سب پر مستزاد کہ ماہیے پر تخلیقی‘ تنقیدی اور تحقیقی تینوں سطح پر کام کیا۔اتنی اصناف میں آپ اپنی شناخت کیسے سمجھتے ہیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ میری شناخت اگر کبھی بنے گی تو میرے سارے کام کے تناظر میں بنے گی۔ایک بات واضح کردوں کہ اگر کوئی کمزور تخلیق کار کئی اصناف میں کام کرے گا تو اس کا ضعف بڑھے گا لیکن اگر کوئی اچھا تخلیق کار کئی اصناف میں اظہار کرے گا تو اس کا ایک کم از کم معیار ہر صنف میں دکھائی دے گا۔میں ریاکاری کی انکساری سے کام نہیں لوں گا۔مجھے اتنا علم ہے کہ اگر آنے والے وقت میں ادب کی کوئی اہمیت اور قدر و قیمت رہی تو میرے کام کے بارے میں‘ میری ادبی شناخت کے بارے میں آنے والا وقت ہی فیصلہ کرے گا۔وہ وقت جس میں‘۔۔۔۔میں‘۔۔۔آپ‘۔۔۔۔میرے موجودہ مخالفین۔۔۔۔اور موجودہ دوستوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہوگا۔تب جو بھی فیصلہ ہوگا درست فیصلہ ہوگا!

☆☆☆

(مطبوعہ: سہ ماہی ’’ماہیا رُوپ‘‘ کراچی شمارہ نمبر۱‘ جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء ماہنامہ ’’کائنات‘‘ اردو دوست ڈاٹ کام۔۔۔کتاب ’’انٹرویوز‘‘ مرتب سعید شباب)